مختصر
تاریخ دکن

برائے مدارس سرکار عالی

(حسب نصاب جدید منظورۂ سررشتۂ تعلیمات)

و

افادۂ عامّہ

مؤلفہ

ہارون خاں شروانی

مطبوعہ شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

۱۳۴۴ ف

قیمت { مجلد عہ؍
غیر مجلد ۱۲؍ار

فہرست مضامین

نشان صفحہ ابتدا

۷۸۶

اعلیحضرت خلد اللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ

تقریب

یہ مختصر کتاب دو تین سال پیشتر لکھی گئی تھی لیکن بعض اسباب کی بنا پر اوسوقت طبع نہیں ہوسکی۔ میرے بعض محبوں نے اصرار کیا کہ اسوقت ہمارے پاس مشکل سے کوئی ایسی تاریخ دکن ہوگی جو سلیس اور دلچسپ پیرایے میں اِس ملک کی تاریخی عظمت کا سکہ ہمارے بچوں بچیوں کے دلوں پر جمادے اور وسعت نظر کے ساتھ ساتھ انھیں حب وطن اور خدمت مالک کی شاہراہ پر گامزن کرے اسلئے اسے طبع کرادیا جائے۔ دوسرے جدید نصاب کے تحت، جو بہت کچھ غور و خوص کے بعد بن کر رائج ہوا ہے، اسکی ضرورت بھی تھی کہ ایک نئی کتاب مدوّن کرکے پیش کیجائے۔ وہ خطّہ جسے "ممالک محروسۂ سرکار عالی" کا لقب دیا جاتا ہے، بعض نہج سے لاثانی ہے۔ اول تو یہ نہ صرف جزیرہ نمائے ہند وسطح مرتفع دکن، بلکہ تمام ملک ہند کا وسطی حصہ ہے۔ غور کیا جائے تو یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ سلطان علاءالدّین خلجی نے دکن کو کیوں فتح کیا! سلطان محمدؐ تغلق نے کیوں دولت آباد کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اورنگ آباد بیٹھ کر کیوں حکومت کرنا ضروری سمجھا۔ نیز یہ اس خطّے کے گوناگوں امتیازات ہی کی وجہ سے تھا کہ حضرت نظام الملک آصفجاہ اول نے ان تمام صوبجات میں سے جو اونکے سامنے گویا بکھرے پڑے تھے، اسی صوبے کو اپنے مرکز کیلئے منتخب کیا، اور انکے جانشینوں کے زمانہ میں انگریزی شہنشاہی حکومت ہند نے سکندرآباد میں ایسی بے نظیر فوجی چھاونی قایم کی۔ دکن ہی وہ خطہ ہے جس میں ہندوستان کی تقریباً تمام نسلوں کا اتصال ہوتا ہے اور یہ کوئی بے تعلق واقعہ نہیں کہ ہم یہاں کے عدیم المثال پایۂ تخت میں کشمیریوں، پنجابیوں، سکھوں، مرہٹوں، تلنگوں، گونڈوں، بھیلوں، پٹھانوں، سیدّوں، شیعوں، سنیوں، مدراسیوں، موپلاؤں، خوجوں، بوہروں، شلالیوں، حبشیوں، غرض ہندوستان کی تمام نسلوں کو ایک دوسرے کے دوش بدوش پاتے ہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو کو

دکن سے بہتر کوئی گہوارہ نہ اپنی ابتدائی زندگی میں نصیب ہوا نہ اسوقت اپنی حیات ثانیہ کے آغاز میں۔ تاریخی اعتبار سے دکن کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شاید ملک ہند کا کوئی دوسرا رقبہ ایسا نہ ہو جسمیں اس قدر افراط سے مختلف سلطنتوں کے پایۂ تخت ملتے ہوں۔ خود شہر فرخندہ بنیاد کے علاوہ کلیانی، سرپور، پٹن، ورنگل، دیوگڑھ (دولت آباد) گلبرگہ، گولکنڈہ، اورنگ آباد، یہ سب شہر اپنے اپنے زمانے کے بادشاہوں، وزیروں، درباری نشیب فراز، ظاہری و باطنی حسن و جمال، جنگ و امن، سب ہی کے تماشے دیکھ چکے ہیں۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے کسی نے اسوقت تک دلچسپ پیرائے میں کیوں بچوں کے لیے اس خطے کے صحیح و سبق آموز تاریخ پر قلم نہیں اٹھایا۔ تعلیم و تدریس کے اغراض کے علاوہ اگر اس کتابچے کی تدوین نے ہمارے ملک کے علمائے تاریخ کو اس دلچسپ راستے کے طرف تھوڑا بہت مائل کردیا تو خاکسار مولّف کی محنت رائیگاں نہ جائیگی۔

آخر میں میں اپنے دو محبّوں یعنے جناب سجاد مرزا صاحب صدر کلیہ تعلیم المعلمین اور جناب علی یار خاں صاحب ناظم سررشتہ معلومات عامہ کا خاص طور شکر گذار ہوں کہ انھوں نے اس کتابچے کا جستہ جستہ مطالعہ کیا اور بعض صحیح واقعات سے مجھے مطلع کیا۔

خاکسار

ہارون خاں شروانی
حیدرآباد دکن

تاریخ دکن

تمہید

یہ چھوٹی سی کتاب سلسلہ نصاب تاریخ منظورہ عالیجناب ناظم صاحب تعلیمات سرکار عالی کی ایک کڑی ہے اور اس میں ابتداء سے آج تک آسان اور دلچسپ پیرائے میں اس ملک کی تاریخ بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو شمالی ہندوستان اور انتہائی جنوب کے وسط میں دریائے گوداوری اور دریائے کرشنا کے طاسوں میں واقع ہے اور جسے عرف عام میں "دکن" کہتے ہیں۔ تفصیلی نصاب میں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ شمالی اور جنوبی ہندوستان کے باہمی تعلقات نظر انداز نہ کئے جائیں اور ساتھ ہی ملک کے تمدنی تاریخ پر زور دیا جائے۔ بظاہر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کو یہ بتانا چاہیئے کہ اس ملک والوں نے تہذیب و تمدن کے میدانوں میں کس قسم کے کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں۔ اس کے لئے بچے کو تاریخی عمارتوں وغیرہ سے واقفیت پیدا کرائی جائے جس سے ایک تو اسے تاریخ سے دلچسپی پیدا ہوگی اور دوسرے لوگوں کے حقیقی خیالات کے ارتقا کی معلومات حاصل ہوگی۔

اس کتاب کو ان ہی تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں دکن

کی تاریخ تمدنی اعتبار سے تقسیم کی جا سکتی ہے۔ نیز چونکہ یہ ملک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ورثہ ہے اور یہ دونوں اس کی دو آنکھوں کی طرح ہیں اس لئے حتی الامکان کسی ایک تاریخی عہد کو خاص طور پر ہندوؤں سے یا مسلمانوں سے وابستہ کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے۔

آخر میں صرف یہ کہنا باقی ہے کہ درس و تدریس کا بہت کچھ انحصار پڑھانے والوں پر ہوتا ہے۔ انہیں چاہیئے کہ بجائے بے سمجھائے ہوئے رٹوانے کے تاریخ میں بچوں کی دلچسپی پیدا کرنے کی کوشش کریں اور باتوں ہی باتوں میں ان کے دلوں میں اپنے بے نظیر ملک کی عظمت کا سکہ بٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تاریخ بینی بالکل بے سود اور رائگاں ہوگی۔

باب ا

دکن کا جغرافیہ

ا۔ اگر تم ہندوستان کا نقشہ دیکھو تو بالکل یہ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی لڑکی نے جگنی دار ہار پہن لیا ہو اور اس کی لڑیوں کے درمیان میں رنگ بھر دیا گیا ہو۔ بس فرق یہ ہے کہ اس ہار کی لڑیاں دو دو ہزار میل لمبی ہیں جگنی کی لمبائی چوڑائی کئی کئی سو میل کی ہے اور لڑیوں کو اوپر کی طرف سے ڈوروں کے جو سلسلے ملاتے ہیں وہ دو ہزار میل سے زیادہ ہیں۔ یہ ڈورے در اصل ہمالیہ پہاڑ ہیں جو باقی ماندہ براعظم ایشیا سے ملک ہند کو جدا کرتے ہیں اور ایک بہت ہی بڑی دیوار کی طرح شمال کی طرف سے اس کو باہر والوں سے بچائے ہوئے ہیں۔ موتیوں کی جن لڑیوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے وہ گویا سمندر کی چمکتی ہوئی لہریں ہیں جو ہمارے ملک ہند کے مشرق اور مغرب کو گھیرے ہوئے ہیں۔ اور وہ خوبصورت جگنی جو نیچے لٹکتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جزیرۂ لنکا ہے جو چاروں طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے لیکن ساتھ ہی جو ہندوستان کے بالکل ہی قریب جنوب میں واقع ہے۔

۲۔ تم دیکھو گے کہ اس میں چار بڑے بڑے پہاڑ ہیں۔ سب سے بڑا پہاڑ تو یہی ہمالیہ ہے جس سے اونچا دنیا کا کوئی بھی پہاڑ نہیں۔ اس سے ذرا جنوب کی طرف

جاؤ تو بندھیا چل اور ست پڑا نظر آتے ہیں جو ملک کو گویا دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ بالکل جنوب میں سمندر کے کنارے مغرب کی طرف مغربی گھاٹ اور مشرق کی طرف مشرقی گھاٹ کے سلسلے ہیں جو راس کماری کے قریب ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں۔ اسی طرح سے اس ملک کے بڑے بڑے دریاؤں پر غور کرو اور شمال و مغرب سے شروع کرو تو پہلے تو دریائے سندھ نظر آتا ہے جو اپنے پانچوں معاونوں سمیت گویا پنجاب کی جان ہے۔ پھر گنگا جی کا دریا جو اپنے شمالی اور جنوبی معاونوں کو لئے ہوئے کلکتہ سے آگے خلیج بنگالہ میں جا گرتا ہے اور شمالی ہندستانی میدان کو زرخیز بناتا ہے۔ اگر گنگا نہ ہوتی تو یہ عظیم الشان میدان نہ انسان کے رہنے کے لئے ہوتا نہ حیوان کے۔ اسی لئے تو ہندو اس دریا کی اتنی عزت کرتے ہیں۔ اس سے جنوب میں آؤ تو پہلے تو تمہیں مغرب کی طرف کو بہتے ہوئے اور پہاڑوں کو کاٹتے ہوئے نربدا اور تاپتی ملیں گے جو بحیرۂ عرب میں گرتے ہیں اور اس کے جنوب میں گوداوری اور کرشنا جو مغربی گھاٹ سے نکلتے ہیں اور اپنے معاونوں اور شاخوں کو لیتے ہوئے خلیج بنگالہ میں جا گرتے ہیں۔

۳۔ یہ سب تو تھوڑا بہت ہندوستان کا جغرافیہ ہوا تم دیکھتے ہو یہ کیسا آسان اور کتنا دلچسپ ہے۔ اب دکن کے جغرافی حالات معلوم کرنا بہت ہی آسان ہوگیا۔ دکن بس اسی ملک کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو دریائے نربدا اور بندھیا چل پہاڑ کے جنوب میں واقع ہے۔ اور جس میں ہو کر دریائے گوداوری اور دریائے کرشنا اور ان دونوں کے معاون ندیاں بہتی ہیں۔

اگر تم نقشے پر غور کرو تو تم دیکھو گے کہ اس حصے کی سطح دوسرے حصوں سے بالکل مختلف ہے۔ اول تو یہ آس پاس کے حصوں سے اونچا ہے۔ اور اسی لئے اس کو دکن کی سطح مرتفع کہتے ہیں۔ یہ سطح مرتفع مشرق اور شمال سے ذرا آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھتی ہے اور مغرب اور جنوب میں ایک ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے دکن کے دریا مغرب سے مشرق کی طرف بہتے ہیں۔ اور ان میں سے دو یعنے گوداوری اور کرشنا سمندر میں گرنے سے پہلے ایک ڈلٹا بناتے ہیں۔

۴۔ دکن ایک اور وجہ سے بھی دوسرے حصوں سے الگ تھلگ ہے، اس لئے کہ یہاں جو قومیں رہتی ہیں انہیں ہندوستان کے سب سے پہلی نسلوں کا خون باقی ہے۔ اس کے مشرقی حصے یعنے تلنگانہ میں اندھرا قوم آباد ہے جو تلنگی بولتی ہے، اور مغربی حصے میں مرہٹے آباد ہیں جس کی وجہ سے اس حصے کو مرہٹواڑی یا مہاراشٹر کہتے ہیں۔ ان دونوں کے جنوب میں ذرا مغرب کی طرف کو ہٹ کر وہ حصہ ہے جسے کرناٹک کہتے ہیں اور جہاں کنڑی زبان بولی جاتی ہے۔

۵۔ مگر تم یہ نہ سمجھنا کہ دکن کوئی کوٹھری ہے اور یہاں کے رہنے والوں سے شمال والوں یا جنوب والوں کا کوئی تعلق نہیں۔ بات یہ ہے کہ اگر کوہ بندھیاچل ذرا زیادہ اونچا ہوتا تو پھر شمالی حصوں سے دکن کا تعلق کم ہوتا، لیکن موجودہ صورت میں یہاں والے آسانی سے نربدا پار جا سکتے ہیں اور نربدا پار والے آسانی سے یہاں آ سکتے ہیں۔ اسی لئے تم دیکھو گے

کہ کس طرح شمالی ہندوستان والوں نے جنوبی ہندوستان پر اور جنوبی ہندوستان والوں نے شمالی ہندوستان پر یکے بعد دیگرے حملے کئے اور اپنا اثر پھیلایا۔ پھر جس طرح شمالی ہندوستان میں آنے کے لئے ہمالیہ پہاڑ کے مغرب میں خدا نے درے یا راستے نکال دئے ہیں اسی طرح دکن کے مشرق اور مغرب میں بمبئی، سورت، مدراس، اور مچھلی بندر جیسی بندرگاہیں ہیں جہاں ہوکر لوگ دوسرے ملکوں سے آسانی کے ساتھ جہازوں میں بیٹھ کر تجارت بیوپار کرسکتے ہیں۔

۷۔ غرض یہ ہے کہ جب تم یہ تاریخ یا کوئی دوسری تاریخ پڑھو تو اس ملک کے جغرافیہ کا ضرور خیال رکھنا اور جب کسی شہر کا نام آئے تو اپنے اُستاد صاحب سے کہہ کر نقشے میں ضرور دیکھ لینا۔

پہلا حصّہ

قدیم زمانہ

(سنہ ۱۳۴۵ء تک)

باب ۲

پہلے زمانے کے قصے

۱۔ ہندوستان کے دوسرے حصوں کی طرح دکن میں بھی ہر طرح کے لوگ رہتے ہیں، کوئی ہندو ہے کوئی مسلمان کوئی عیسائی، اور پھر ہندوں کے بے شمار حصے ہیں، کوئی تلنگی ہوتا ہے کوئی مرہٹی کوئی کنٹری۔ تم نے مرہٹی تلنگی لکھی دیکھی ہو گی اور اردو تو تم ماشاءاللہ خود بھی لکھتے پڑھتے ہو، دیکھو ان تینوں زبانوں میں کیسا فرق ہے، اور یہ سب پھر انگریزی سے کس قدر مختلف ہیں۔ سوچو تو ہندوستان کی تاریخ بس انہیں چار قسم کے "الف بے تے" کی تاریخ ہے۔ پہلے دراوڑی قوم آئی جس کے جانشینوں نے تلنگی کے حروف ایجاد کئے، پھر آریہ جس کے جانشینوں نے مرہٹی کے جیسے حرفوں سے لکھنا شروع کیا، پھر عرب اور ایرانی اور ترک جنھوں نے رفتہ رفتہ فارسی حروف اس ملک میں رائج کیے، اور آخر میں انگریز جن کی مادری زبان انگریزی ہے۔

۲۔ سب سے پہلے جو قوم ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھی انہیں کو لارمی کہتے ہیں، اس لئے کہ آج کل بعض قومیں اس وقت

کولار اور اوٹا کمنڈ کے قریب ملتی ہیں جن میں اس وقت تک تقریباً اسی طرح کے قاعدے جاری ہیں جو ہزاروں سال پہلے جاری تھے۔ تم نے شاید بھیل، گونڈ نہ دیکھے ہوں گے، جو ہمارے دکن کے بالکل شمالی اضلاع میں ملتے ہیں۔

پہلے زمانے میں یہ بیچارے نہ کھانا پکانا جانتے تھے نہ کاشتکاری، بلکہ جو کچھ شکار ہاتھ آیا اسے کھا لیا اور جو پھل پھلاری نظر آئی اسے چٹ کر لیا؛ ان کے بعد وہ نسل اس ملک میں آئی جسے دراوڑی کہتے ہیں اور جن کے جانشین آج کل تلنگی، کنٹری، اور تامل بولتے ہیں یہ لوگ شاید افغانستان کی طرف سے آئے ہوں گے اور آتے ہی قدیم کولاریوں سے مل جل کر رہنے لگے ہوں گے۔ یہ دراوڑی اچھے خاصے مہذب تھے اور پہلے تو پتھر مار کر شکار کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ لوہے کے اوزار بنانے، کپڑا پہننے اور بجائے غاروں کے مکانوں اور گاؤں میں رہنے لگے۔

ان کی تہذیب اور کولاریوں کی بربریت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور ہزاروں برس پہلے بھی ملیبار کے ساحل پر ان کے جہاز عرب اور مغربی ایشیا کے ساتھ برابر تجارت میں مشغول تھے اور وہاں کی چیزیں یہاں اور یہاں کی چیزیں وہاں لاتے لے جاتے تھے۔

۳۔ دراوڑیوں کے بعد جو قوم ہندوستان میں آئی اس نے ہمیشہ کے لئے اپنا اثر اس ملک پر ہی نہیں بلکہ تمام دنیا پر قائم کردیا۔

یہ آریہ تھے، جن کی ایک شاخ یورپ اور دوسری ایران اور تیسری ہندوستان پہنچی۔ ہندوستان آنے سے پہلے ہی یہ لوگ نہایت مہذب تھے اور جہاں تک ہمیں علم ہے وہ آتے ہی لوہے کے اوزاروں سے کام لینے، کاشتکاری کرنے، گاؤں میں رہنے لگے، اور انھوں نے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک آنے جانے کے لئے راستے بھی بنا لئے۔ گو یہ سب ہر قسم کے روزمرّہ کے قدرتی اشیا کی مثلاً سورج، آسمان، آگ، پانی کی پوجا کرتے تھے، لیکن ساتھ ہی ان کی کتابوں سے (جس میں سب سے بڑی کتاب رگ وید ہے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسی عظیم الشان ذات کے بھی قائل تھے جو ان سب دیوتاؤں سے بڑی ہو۔ رفتہ رفتہ یہ آریہ جنوب کی طرف بڑھے اور دراوڑیوں سے دوچار ہوئے لیکن انھوں نے دیکھا کہ دراوڑ ہی خود ایک مہذب قوم ہے اس لئے بجائے انھیں نکال لینے کی کوشش کرنے کے انھوں نے ان سے ایک طرح کا سمجھوتہ کر لیا کہ بھائی تم بھی ملک میں رہو اور ہم بھی رہیں۔ ان آریوں میں طرح طرح کے پیشے موجود تھے، مگر آج کل کے زمانے کی سی ذاتیں نہیں تھیں اور اگر تم وید پڑھو تو تم دیکھو گے کہ بعض بڑے بڑے لوگ ایسے گزرے ہیں جن کے باپ کا پیشہ کچھ تھا اور ماں کا کچھ، یہ نہیں کہ برہمن ہے تو اس کا بیٹا بھی مالا جپتا رہے اور چھتری ہے تو اس کا بیٹا بھی تلوار اٹھانے کا اہل ہو۔

۴۔ آریوں کے دکن میں پھیلنے کا حال ہمیں رامائن سے معلوم

ہوگا جس میں لکھا ہے کہ جب رامچندر جی کو ان کے والد نے چودہ برس کا دیس نکالا دیا تو چلتے چلتے وہ اپنے پیارے بھائی لچھمن جی اور اپنی چہیتی بیوی سیتا جی کے ساتھ کس طرح دکن کی طرف آئے تاکہ یہاں کے لوگوں میں آریہ تہذیب پھیلائیں، اور جو آریہ مبلّغ دکن میں آریہ تہذیب پھیلا رہے تھے انہیں دشمنوں سے بچائیں۔ انھوں نے دکن میں بہت سے راکھشسوں یعنی بے دینوں کو شکست دی اور ان کے ایک بہت بڑے سردار کو نیچا دکھایا۔

اسی سردار کا بھائی راون لنکا کا راجہ تھا، اور جب اسے معلوم ہوا کہ میرا بھائی لڑائی میں مارا گیا ہے تو اسے بڑا ہی غصّہ آیا، اور دھوکہ دے کر خود سیتا جی کو لنکا اڑا لے گیا۔

رامچندر جی کی چہیتی بیوی چھٹ گئیں تو وہ بھلا کب چین سے بیٹھ سکتے تھے اور انھوں نے یہاں دکن والے ہنومان جی سے ایکا کر کے آخر لنکا فتح کر ہی لیا۔

۵ — رامائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں برس پہلے ہی شمال کے آریوں نے لنکا تک تمام جنوبی ہند پر اپنا اثر قائم کر لیا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود آریہ قوم نے بڑی بھاری ترقی کر لی تھی اور نہ صرف بادشاہ زادے بلکہ بہت سے معمولی لوگ بھی پڑھے لکھے ہوتے تھے، اور بہت سے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر ملک کے مختلف حصوں کو جا کر وہاں والوں کو طرح طرح کی نصیحتیں کر کے اپنا ہم خیال بنا لیتے

خواہ اس طرح گھر چھوڑنے میں ان کو کتنی ہی تکلیف کیوں نہ پہنچے۔
راماین سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گو اس پرانے زمانے میں بادشاہ بالکل آزاد تھا کہ جو چاہے کرے مگر ساتھ ہی رعایا کی رائے کی بھی قدر کی جاتی تھی اس لئے کہ رعایا ہی سے توڈر کر مہاراجہ رامچندر جی کے والد مہاراجہ دسرتھ نے انہیں چودہ برس کا دیس نکالا دیا تھا تاکہ ان کی موجودگی میں بھرت جی کے گدی پر بیٹھنے سے عوام الناس میں بے چینی پیدا نہ ہو جائے۔

باب ۳

مہاتما گوتم بدھ (۵۶۷ قم تا ۴۸۲ قم)
اور مگدھ کا تمام ملک ہند پر قبضہ
(۶۰۰ ق م تا ۲۳۱ ق م)

۱۔ جب آریہ تمدن تمام ملک میں پھیل گیا تو جگہ جگہ چھوٹی بڑی سلطنتیں بھی قائم ہوگئیں جن میں سے شمالی ہندوستان کی سلطنت مگدھ شروع میں سب سے زیادہ طاقتور تھی۔ رام چندر جی کو اب ہزاروں سال ہو گئے تھے، پھر بھی ان کی سلطنت کوسل برابر قائم تھی، گو یہ مگدھ کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ ہندوؤں میں چار مشہور ذاتیں یعنی برہمن، چھتری، ویش اور شودر موروثی ہو گئی تھیں۔ ہندوستان میں تجارت، صنعت و حرفت ترقی پر تھی اور علاوہ بہترین زیورات کے یہاں کے سوتی اور ریشمی کپڑے، کمبل، فرش فروش صرف ملک ہی کے لئے کافی نہیں ہوتے تھے بلکہ دوسرے مقامات کو بھی بھیجے جاتے تھے۔ اس تجارت کی وجہ سے ملک کے مختلف حصوں کے درمیان بڑی بڑی شاہراہیں بن گئی تھیں جن پر سے سوداگر اپنا سامان نہایت اطمینان کے ساتھ لے جا سکتے تھے۔

۲۔ یہ سب ہو رہا تھا اور ساتھ ہی لوگ مذہب کی بابت بھی غور

کر رہے تھے کہ آیا واقعی یہ دیوتا، دیبیاں وغیرہ ہمیں نجات دلا سکتی ہیں، اور آیا اس زمانے میں دیوتاؤں کے سامنے طرح طرح کے جانداروں کی قربانیاں کرنے کا جو طریقہ رائج ہے اس سے واقعی ہمیں کامیابی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ سب سے زیادہ جس شخص نے ان مسئلوں پر غور کیا وہ مہاتما گوتم بدھ تھے۔ یہ نیپال کی ایک سلطنت کے راج کمار تھے اور وہ چاہتے تو آرام اور آسائش سے اپنی زندگی گزارتے۔ مگر اس کے بجائے وہ سوچنے لگے کہ آخر انسان اس دُنیا میں کیوں پیدا ہوا ہے اور اسے کیا کرنا چاہیئے کہ دُنیا کی تکلیفیں دُور ہوں۔ اسی سوچ بچار میں انھوں نے اپنے محلات، ماں باپ، بیوی بچے سبھی کو چھوڑا اور جنگل میں نکل گئے۔ چلتے چلتے وہ شہر گیا پہنچے اور وہاں ایک پیپل کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے کہ یکایک انھیں روشنی نظر آئی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ انسان کو صرف ایک طرح سے تمام تکلیفوں سے نجات حاصل ہو سکتی ہے، وہ نفس کی صفائی ہے، یعنے انسان جس چیز کو بُرا سمجھے اسے چھوڑے اور جو چیز اچھی ہو اسے حاصل کرے۔ انھوں نے اس عقیدے کو چاروں طرف پھیلانا شروع کیا کہ مرنے کے بعد انسان جو دوسرے جانداروں کے قالب میں چلا جاتا ہے تو یہ اس کے لئے بیحد تکلیف کا باعث ہے، لیکن اگر کوئی شخص انتہائی نفس کشی اختیار کرے گا تو پھر آخر اسے "نروان" کا مرتبہ مل جائے گا، یعنے وہ بجائے کسی مادّی قالب میں جانے کے اس بڑی "روح" میں جا کر مل جائے گا جو سب پر حاوی ہے۔ مہاتما بدھ

نے بت پرستی، ذات پات سب پرانی رسموں کو بالکل بیکار بتایا اور کہا کہ سب سے بڑی چیز بس ہمارے اپنے کام ہیں اور ہمارے یہ اعمال ہی ہیں جنہیں ہم اپنے ساتھ اس دُنیا سے لے جائیں گے۔

۳ ۔ یہ مذہب دن دوگنا رات چوگنا پھیلا یہاں تک کہ مگدھ کا مہاراجہ بھی سارا ابھی اس کا پیرو ہوگیا اور مہاتما بدھ کے نروان سے پہلے ہی یہ مذہب ملک ہند کے ایک بڑے حصے کا مذہب ہوگیا تھا تا آنکہ دکن اور لنکا تک میں اس کے پیرو پیدا ہو گئے ۔ اسی زمانے میں مگدھ کے راجہ نے دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک نئے شہر پاٹلی پتر کی بنیاد ڈالی جو آگے چل کر بدھ مت کا سب سے بڑا مرکز ہوگیا ۔ یہ وہی شہر ہے جسے آج کل پٹنہ عظیم آباد کہتے ہیں ۔ یہاں کے شاہی خاندان نند کے زمانے میں پہلی مرتبہ یورپ کے ایک بہت بڑے بادشاہ سکندر یونانی نے ہندوستان پر حملہ کیا ۔ تم یہ تو جانتے ہو کہ یورپ ہندوستان سے بہت ہی دور ہے ۔ سکندر درمیان کے سب ملک فتح کرکے پنجاب آیا کا اس لئے کہ اس زمانہ میں اس ملک کی دولت اور ثروت تمام دنیا میں مشہور تھی ۔ اس وقت تک پنجاب کی سلطنتوں میں آپس میں کسی قسم کا ایکا نہ تھا، چنانچہ بعض ریاستیں ایسی بھی تھیں جنہوں نے محض روپیہ یا ظاہری عزت کی خاطر اپنے ملک کے دشمن سکندر کو طرح طرح کی مدد دی اور صرف پورس ہی ایک ایسا پنجابی راجہ نکلا جو سکندر کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا ۔ لیکن اسے دریائے جہلم کے کنارے سکندر نے شکست

دے دی ۔ اس کے بعد سکندر نے چاہا کہ دریائے ستلج کے پار یعنے گنگا جمنا کے دوآبے جائے، لیکن اس کے تھکے ماندے سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے بالکل انکار کر دیا اور آخر کار اسے واپس جانا پڑا مگر اُسے یونان واپس پہنچنا ہی قسمت میں نہیں لکھا تھا اور وہ نوعمری کی ہی حالت میں بابل پہنچکر مر گیا ۔

۴ ۔ سکندر اپنے پیچھے پنجاب کا کام اپنے ایک نائب کے سپرد کر گیا تھا، جو اسی کی طرح یونانی تھا ۔ لیکن اس کے پیٹھ موڑتے ہی دریائے سندھ کے مشرق کا تمام ملک اس کے قبضے سے نکل گیا اور مگدھ کے ایک جلا وطن سردار چندر گپت اور اس کے وفادار ملازم چانکیا نے اپنے پیارے دیس کی آزادی کا پھریرا کھول کر بہت جلد ہندوستان سے یونانی اقتدار کا خاتمہ کر دیا ۔ یہی وہ چندر گپت ہے جس نے مشہور و معروف خاندان موریا کی بنیاد ڈالی اور جس کے وزیر چانکیا اور پوتے اشوک اعظم کا نام رہتی دنیا تک برابر قائم رہے گا ۔

۵ ۔ چندر گپت جس وقت مگدھ کے تخت پر بیٹھا اسی وقت سے وہ تمام ہندوستان کے اتحاد خواب دیکھنے لگا ۔ یونانی ہندوستانیوں سے خار کھائے ہوئے تھے اس لیے ان کے ایک سردار سلیوکوس نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ۔ لیکن اسے بھی نیچا دیکھنا پڑا، چنانچہ اسے افغانستان کا تمام ملک چندر گپت کے نذر کرنا پڑا اور ساتھ ہی اپنی بیٹی اس کے نکاح میں دے دینی پڑی ۔ اس زمانے کے ہندوستان کے حالات

ہمیں دو بڑی بڑی کتابوں سے معلوم ہوتے ہیں ایک تو یونانی سفیر کی لکھی ہوئی کتاب سے اور دوسرے اس کتاب سے جو چانکیا نے لکھی۔ ان دونوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں صنعت و حرفت کا بڑا چرچا تھا اور یہاں کی بنی ہوئی چیزیں غیر ولایتوں میں بھی جاتی تھیں۔ ملک میں علاوہ بہت سی چھوٹی چھوٹی سڑکوں کے ایک بڑی شاہراہ پاٹلی پتر کو افغانستان سے ملاتی تھی۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں خصوصاً پاٹلی پتر میں تمام انتظامات چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے سپرد تھے اور یونانی سفیر کہتا ہے کہ اس کے زمانے کے ہندوستانی اپنی سچائی اور ایمانداری کے لئے مشہور تھے۔

۱۱۔ چندر گپت کے بعد اس کا بیٹا اور اس کے بعد اس کا پوتا اشوک اعظم تخت نشین ہوئے اور انہوں نے مگدھ کے شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ جب اشوک تخت پر بیٹھا ہے اس وقت بھی مگدھ میں افغانستان سے جنوبی ہند کے دریائے پینار تک کا سب علاقہ شامل تھا۔ لیکن بنگالہ کے جنوب میں خلیج بنگالہ کے کنارے جو ملک کلنگ تھا وہ آزاد تھا۔ لیکن اشوک نے اسے بھی فتح کر لیا اور اس طرح تقریباً تمام ملک ہند اشوک کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ یہ سلطنت کلنگ نہایت طاقتور سلطنت تھی جس کی وجہ سے اشوک کو اس کے زیر کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی اور بڑا خون خرابا کرنا پڑا جس کا اس کے دل پر بہت کچھ اثر پڑا اور اس نے اس طرح کسی آزاد ملک پر جبراً قبضہ کرنے سے بالکل توبہ

کر لی اور اس کے بعد کسی ملک پر کبھی فوج کشی نہیں کی۔
ے ۔ گو اشوک ہر مذہب کے لوگوں سے محبت کرتا تھا اور کسی کو جبراً اپنا مطیع کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس نے بودھ مذہب پھیلانے کے لئے دور دور مبلغ بھیجے اور اس کی حکومت کی شہرت یورپ، ایشیا اور افریقہ تینوں براعظموں میں پھیل گئی ۔ یہی نہیں بلکہ اس نیک دل شہنشاہ نے اپنے بھائی اور اپنی بہن کو جنوبی ہندوستان اور لنکا تک بھیجا کہ وہاں پہونچکر مہاتما گوتم بدھ کے وعظ و نصیحت اور رحم و کرم کے خیالات لوگوں میں پھیلائیں ۔ پھر اس نے اپنی وسیع سلطنت کے ہر کونے میں اپنے فرامین بڑی بڑی لاٹوں اور غاروں اور پہاڑوں کی چٹانوں پر کھدوائے جس میں اس نے یہ ہدایت کی کہ بھائیو دوسرے مذہب والوں کے ساتھ اچھی طرح پیش آؤ، آدمیوں اور جانوروں کے ساتھ رحم کا برتاؤ کرو، پاکی، صفائی، سچائی کو ہاتھ سے مت جانے دو، غصہ، غرور اور ظلم سے دور بھاگو اور کسی کی بہتری اور بڑائی کو حسد کی نگاہ سے نہ دیکھو ۔ ایسے منار اور چٹانیں افغانستان سے میسور تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اشوک کو نیکی اور سچائی کتنی پسند تھی اور آج اس کی موت سے دو ہزار برس بعد بھی کس طرح اس کی عظمت کا نقشہ ہمارے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے ۔

باب ۴

خود مختار سلطنتیں

مشرقی اور مغربی دکن میں

(۲۳۱ ق م تا ۱۳۴۵ عیسوی)

---

۱ ـ تم یہ مت سمجھنا کہ اشوک نے شمالی اور جنوبی ہندوستان کے سب پرانی سلطنتوں کو مٹا دیا اور وہاں کے باشندوں کو غلام بنا لیا بلکہ ہوا صرف یہ کہ ہر جگہ ریاستیں قائم رہیں مگر انہیں اشوک کے اصول کو اختیار کر لینا پڑا اور اس کی باجگزار بن گئیں ـ دکن میں اس سے پہلے سے کلنگ اور اندھرا قومیں آزاد تھیں ـ اور جب اشوک اس دنیا سے چلا گیا تو انھوں نے پھر سر اٹھایا ـ اندھرا قوم کا اصلی وطن دریائے گوداوری اور دریائے کرشنا کے درمیان سمندری ساحل کے قریب تھا اور جب یہ آزاد ہوئی تو اس کا پایہ تخت پہلے شہر سری کاکولم اور پھر شہر امراوتی (بر دریائے کرشنا) مقرر ہوا ـ اندھرا قوم نے سب سے زیادہ ستواہن یا شالی واہن خاندان کے حکومت میں فروغ پایا چنانچہ اس میں موجودہ ممالک محروسہ سرکار نظام ممالک متوسط اور مغربی گھاٹ تک کا تمام ملک شامل ہوگیا اور حضرت عیسی

سے سو ڈیڑھ سو برس پہلے اس کا مقابلہ سوائے مگدھ کے اور کوئی دوسری سلطنت نہیں کرسکتی تھی۔ اگر تم اورنگ آباد جاؤ تو پیٹن یا پیٹھان ضرور جانا اس لئے کہ یہ اندھرا سلطنت کے مغربی علاقے کا صدر مقام تھا اور اس میں آج بھی سینکڑوں برس بعد اس زمانے کے محلات اور عمارات موجود ہیں۔ شالی واہن خاندان کے زمانے میں لوگوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل تھی اور بودھ مت اور ہندو مذہب دونوں کے پیرو ایک دوسرے کے ساتھ نہایت آزادی سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بودھ مذہب کو فروغ تھا اور ان کے راہبوں اور مذہبی رہنماؤں کے رہنے کے لئے پہاڑ کاٹ کاٹ کر بڑے بڑے ایوان اور طالب علموں کے رہنے کے کمرے حمام اور معبد بنائے گئے تھے جس میں سے سب سے مشہور وہ کھدے ہوئے ایوان اور معبد ہیں جو کارلی اور ناسک میں ہیں۔ تم کبھی اس طرف جاؤ تو یہ نفیس عمارتیں ضرور دیکھنا کہ ہمارے دیس کے کاریگروں نے پہاڑوں کو کھود کر کس طرح سے ایسے عمدہ ایوان، رہنے کے مقامات، عبادت گاہیں بنائی ہوں گی۔ ملک میں صنعت و حرفت ترقی پر تھی اور پیٹھان اور کلیان مغربی دکن میں تجارت کے بڑے بڑے مرکز بن گئے تھے۔ اندھرا خاندان کے راجہ تیسری صدی عیسوی تک برابر حکومت کرتے رہے اور انہیں رفتہ رفتہ انہی قوموں نے زیر کر لیا جن پر انھوں نے کسی زمانے میں حکومت کی تھی۔

۲ — اندھرا قوم کے زوال پر دکن کے ایک سرے سے دوسرے

سرے تک بدامنی پھیل گئی اور کہیں تو چھوٹے چھوٹے زمیندار سلطنت کا دعوے کرنے لگے کہیں پلاووں (پہلوون) کی طرح کوئی غیر ملکی خاندان دکن میں گھس آیا اور اسے اپنا ملک بنا لیا۔ یہ افراتفری برابر چھٹی صدی عیسوی تک جاری رہی جب کہ پلاووں کی طرح چالوکی راجپوت شمال سے دکن کی طرف آئے اور پلاووں کو ان کے صدر مقام بادامی سے نکال کر تمام دکن پر قبضہ جما لیا۔ ان چالوکیوں میں سب سے بڑا بادشاہ پلکیشن دوم گذرا ہے، جس نے شمالی ہندوستان کے نہایت زبردست مہاراجہ ہرش کو دریائے نربدا پر شکست دے کر جنوب سے شمال تک اپنا سکہ بٹھا دیا اور گجرات، مالوہ، گوداوری، اور کرشنا کے بیچ کا حصہ، غرض تمام دکن کو متحد کر دیا۔

۳۔ اورنگ آباد کے قریب نواب سالار جنگ بہادر کے جاگیر میں اجنٹہ کے جو غار ہیں ان میں سے بہت سے غار اسی چالوکیہ عہد کے کھدے ہوئے ہیں، اور ان پر دو ہزار برس پہلے جو طرح طرح کی تصویریں بنائی گئی تھیں وہ آج تک موجود ہیں۔ ان میں سے بہت سی تصویریں ان غاروں کی چھتوں پر بنی ہوئی ہیں جس میں سے ایک میں کسی ہندوستانی دربار میں مہاراجہ کے سامنے چند ایرانی سفیر دکھائے گئے ہیں، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکن کی شہرت کس طرح ہندوستان سے بھی باہر تک پہنچ گئی تھی۔ دکن ایران ہی میں نہیں بلکہ ملک چین میں بھی مشہور ہو گیا۔ بودھ مذہب کے سرزمین مقدس ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں

باہر کے بودھی آتے تھے اور جہاں جہاں مہاتما بدھ گئے تھے یا جہاں بودھ مت کا عروج تھا وہاں مختلف مدرسوں، معبدوں اور مندروں کی جاترا کرتے تھے۔ ان میں سے مشہور چینی سیاح اور جاتری ہیوئن سانگ تھا۔ یہ پلکیشن کے عہد میں دکن آیا اور یہاں منجملہ دوسرے مقامات کے اجنتا بھی گیا۔ وہ اپنے سفرنامے میں دکھنیوں کی بڑی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ پلکیشن کے ملک میں علم کی بڑی قدر کی جاتی ہے اور یہاں کے لوگ بڑے بہادر ہیں اور محض اپنی بہادری کی وجہ سے انھوں نے دوسرے ملکوں پر اپنا سکہ جما دیا ہے۔ نیز یہاں کسی مذہب کے ساتھ برا سلوک نہیں کیا جاتا اور بودھ مذہب والوں کی طرح ہندو مذہب کے پیروں کو بھی پوری آزادی حاصل ہے۔

۴۔ پلکیشن کے زمانے میں ہی ملک کے بعض حصوں میں بےچینی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ اس کے انتقال کے کوئی سو برس کے بعد چالوکیوں کے راج کا خاتمہ ہو گیا اور ان کی جگہ راشٹر کوٹ خاندان کا سرگروہ بادشاہ بن گیا۔ خود راشٹر کوٹ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ مہاراشٹر یا مرہٹواڑی کے رہنے والے تھے۔ اس سے پہلے اس قوم کا ذکر دو دفعہ سننے میں آتا ہے، ایک تو اشوک کے عہد میں کہ یہ شہنشاہی عقیدے کے پیرو ہو گئے یعنی انھوں نے بودھ مت اختیار کر لیا، اور دوسرے اس وقت جب کھرادیلا نے جو کلنگ کا راجہ تھا، اندھرا ملک کو پار کر کے ان کے ملک پر قبضہ کر لیا۔ لیکن ان باتوں کو زمانہ گزر چکا تھا،

اور اب جو یہ مرہٹہ بادشاہ میدان میں آئے ہیں وہ ایک بالکل آزاد سلطنت کے حکمراں ہیں اور ان میں بعض کے کارہائے نمایاں ہمیشہ ہمیشہ یاد رہیں گے ۔ ان ہی میں سے ایک یعنے کرشنا اول نے پہاڑ کھود کر ایلورا میں کیلاسش کا عظیم الشان بت خانہ بنایا جو اس ملک کے عجائبات میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ایک جانشین نے جنوبی ہندوستان پر جا کر وہاں کے تامل سلطنت چولا کو زیر کیا اور اپنی سلطنت دریائے کاویری تک پھیلا دی ۔ ان کے زمانے میں اجنتہ کے غاروں میں اضافہ کیا گیا اور اس عہد کے مذہبی اور رواداری کا جو عالم تھا وہ تمہیں ایلورا اور اجنتہ کے ایوانوں میں نظر آئے گا کہ ان کے ایک حصہ بودھ مت کے لئے وقف ہے تو دوسرے حصہ میں ہندو دیوتاؤں اور دیبیوں کی مورتیں ہیں اور تیسرے میں جینیوں کے بزرگوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں ۔

۵ ۔ راشٹر کوٹ خاندان شاہی کے زوال پر دکن میں پھر افراتفری پھیل گئی اور پہلے تو ایک جنوبی حکمراں راجہ راج اعظم نے (جو چولا کا بادشاہ تھا) دکن کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کر لیا پھر چالوکیہ راجپوت ازسرنو مغربی دکن پر قابض ہو گئے اور کلیانی کو اپنا پایہ تخت بنایا ۔ لیکن یہ دوسرے چالوکیوں کی حکومت بھی زیادہ نہیں رہی اور دکن دو بڑی بڑی حکومتوں میں تقسیم ہو گیا جن میں سے ایک یعنے یادوراجوں کا پایہ تخت دیوگڑھ تھا (جسے اب دولت آباد کہتے ہیں)

اور دوسرے یعنی کاکاتیا راجوں کا پایہ تخت ورنگل ۔ ان دونوں میں ورنگل کا راج بہت زیادہ طاقتور تھا اور یہاں کے فرمانرواؤں نے جنوب میں نیلور تک فتح کر لیا یہاں تک کہ اگر نیلور کا سفیر تکنا سومایاجی اپنی تدبیروں سے کام نہ نکالتا تو شاید نیلور مستقل طور پر ورنگل کا صوبہ بن جاتا ۔ ساتھ ہی یہاں کے کاکاتیوں نے تلنگی زبان کو ترقی دی اور اپنے پایہ تخت میں بہت سے معبد اور دوسرے عمارات بنا کر (جس میں دیول ہزار ستون کا تم نے یقیناً نام سُنا ہوگا) اس کو زینت دی ۔ لیکن دکن آپس کے لڑائی جھگڑوں کا شکار ہو رہا تھا ، اور جب ملک کے باشندوں میں اتفاق نہیں ہوتا تو پھر وہ کمزور ہو جاتے ہیں اور بیرونی حملہ آور کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔ بس یہی ہوا یعنی شمالی ہندوستان کی طرف سے ایک سپہ سالار ملک کافور آیا اور گویا آنکھ جھپکنے میں دکن نے اس کے سامنے ہتیار ڈال دیئے ۔

باب ۵

دہلی والے دکن میں

(تا ۱۳۴۵ء)

۱۔ جب دکن میں پلکیشن دوم کا دور دورہ تھا تو اس وقت عرب میں حضرت محمد صلعم اپنے ہم قوم عربوں سے یہ فرما رہے تھے کہ بھائیو تم میں طرح طرح کی بڑی عادتیں پیدا ہو گئی ہیں، تم شراب جیسی ناپاک چیز پینے لگے ہو جس سے تم میں اور جانوروں میں کوئی فرق نہیں رہتا، اپنی بیٹیوں کو زندہ گاڑ دیتے ہو، بتوں کو پوجنے لگے ہو، اور آپس میں لڑائی جھگڑا کرنے لگے ہو، تمہیں چاہیئے کہ بس ایک خدا کی پوجا کرو، صرف اسی سے ڈرو، جھوٹ کبھی نہ بولو، اپنے پیارے بچوں بچیوں سے محبت کرو اور آپس میں بھائیوں کی طرح رہو۔ یہ اچھی اچھی باتیں بدبخت عربوں کو کب پسند آتی تھیں اس لیے انہوں نے حضرت محمد صلعم پر اور ان کے پیرو مسلمانوں پر طرح طرح کے ظلم کیئے اور آخر کار وہ اس پر مجبور ہو گئے کہ اپنے پیارے دیس مکہ کو چھوڑ کر مدینہ جا بسیں۔ یہاں پہنچ کر خدا تعالیٰ نے حضرت محمد اور مسلمانوں کی مدد کی اور آخر کار پیغمبر

کسی قسم کا جبر کئے ہوئے رفتہ رفتہ خود حضرت محمدؐ کے زندگی ہی میں تمام ملک عرب مسلمان ہوگیا۔ ان کی وفات کے بعد مسلمانوں نے چند ہی سال میں تمام شمالی افریقہ، شام، ایشیائے کوچک، ایران، افغانستان سب ہی فتح کرلیا اور آخر کار تین سو برس کے اندر اندر وہ پنجاب اور شمالی ہندوستان کے بھی مالک بن گئے۔

۲۔ ۱۲۰۶ء میں ان مسلمانوں نے اس ملک ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا اور پہلا مسلمان بادشاہ جس نے اس ملک اس دیس کو اپنا دیس سمجھا اور ہندوستانی بن کر رہنے لگا وہ سلطان قطب الدین ایبک تھا، جو اصل میں ترک غلام تھا لیکن محض اپنی قابلیت سے رفتہ رفتہ ہندوستان کا بادشاہ بن گیا تھا۔ اس کے بعد دہلی کے ہندی مسلمان بادشاہوں نے دریائے نربدا تک کا ملک فتح کرلیا، لیکن وہ جنوب میں نہیں پہنچ سکے اور تقریباً سو برس تک دکن کے ہندو ریاستیں یعنی دیوگڈھ کے یادو اور ورنگل کے کاکاتیا برابر آزاد رہے۔ ان سو برسوں میں شمالی ہندوستان کے ہندؤں اور مسلمانوں میں آپس میں طرح طرح کے تعلقات پیدا ہوگئے تھے۔ اچھی ذات والے راجے مہاراجوں کی لڑکیوں کے دہلی کے سلطانوں کے ساتھ نکاح ہونے لگے تھے، ساتھ ہی ہندو نہایت امن و اماں سے اپنے مذہب کے رسوم پر عمل کرتے تھے اور بہت کم مثالیں اس کی ملتی ہیں کہ بادشاہ نے کسی کو جبراً اپنا مذہب بدلنے کے لئے کہا ہو۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

ہندو اور مسلمان کے باہمی میل سے ایک مشترک زبان پیدا ہوگئی تھی جسے پہلے "ہندی" اور پھر رفتہ رفتہ "اُردو" کہنے لگے۔ اس زبان کا ڈھانچہ تو لوگوں کی عام بول چال یعنے پراکرت کا تھا لیکن فارسی اور چند ترکی اسمار کے اضافے سے اس میں ایک نئی شیرینی پیدا ہوگئی ۔ دہلی کے مسلمانوں کے دربار میں اس زبان کو اتنی ترقی ہوئی کہ امیر خسرو جیسے عالی دماغ شاعر نے اس میں دوہے اور چوپئیاں کہیں جن میں سے بعض آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں ۔ یہی وہ زبان ہے جو آج ملک ہند کے زیادہ تر حصے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور جو ہمارے ممالک محروسہ سرکار عالی کی دفتری زبان ہے ۔

۳ ۔ بہر حال تم اوپر دیکھ چکے ہو کہ دکن کی ریاستیں آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے نہایت کمزور ہو رہی تھیں ، اور جب وقت آیا اور دہلی کے شہزادہ علاء الدین نے اپنے چچا سلطان جلال الدین فیروز خلجی کی طرف سے ان پر حملہ کیا تو یہ کمزور ریاستیں شمالی حملہ آوروں کی تاب نہ لاسکیں ۔ علاء الدین نے یہ مشہور کیا کہ میں اپنے چچا سے لڑ کر آیا ہوں اور میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی پر حملہ کردوں ، جس کی وجہ سے دیوگڑھ کا راجہ رام دیو بالکل بے پرواہ ہوگیا ، اور جب علاء الدین نے ایک ساتھ دیوگڑھ کے عظیم الشان قلعہ پر حملہ کیا تو یہاں کے راجہ کو ہتھیار ڈال دینے پڑے اور علاوہ ایک بہت بڑی رقم کے جو اسے بطور خراج دینی پڑی اسے برار کے علاقے ایلچ پور سے بھی دست بردار ہونا پڑا ۔

۴ - لیکن شاید یہ خیال کر کے کہ دہلی بہت دور ہے، رام دیو نے خراج بھیجنے میں کوتاہی کی اور سلطان نے اسے سزا دینے کے لئے اپنے سپہ سالار ملک کافور کو (جو خود ایک نو مسلم تھا اور محض اپنی قابلیت کی وجہ سے اتنا بڑا عہدہ دار بن گیا تھا) دکن کی طرف روانہ کیا۔ اس نے راجہ کو پھر شکست دی اور اسے اور اس کے خاندان کو دہلی بھیج دیا۔ سلطان اس کے ساتھ نہایت اچھی طرح سے پیش آیا اور اس سے یہ وعدہ لے کر کہ وہ پابندی کے ساتھ خراج ادا کرے گا، اسے واپس دیوگڑھ روانہ کر دیا اور اس کی ریاست اسی کو بخش دی۔ اس کے بعد وہ ورنگل کی طرف پلٹا اور یہاں کے راجہ پرتاب رودر کو شکست دے کر اس کو بھی خراج دینے پر مجبور کیا۔ جب اسے ان دونوں دکھنی ریاستوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو وہ مزید جنوب کی طرف گیا جہاں کے تمام ملک پر اپنا قبضہ جما کر وہاں کے راجوں مہاراجوں سے خراج لے کر واپس دہلی آ گیا۔ دیوگڑھ کے راجہ رام دیو کے انتقال کے بعد اس کے جانشینوں نے پھر بغاوت کا علم بلند کیا اور آخر کار علاءالدین کے ایک جانشین قطب الدین مبارک شاہ نے پھر فوج کشی کی اور باغی راجہ کو اپنی پاداش کو پہنچایا۔

۵ - ابھی تک دیوگڑھ اور ورنگل پر دہلی والوں کا براہ راست قبضہ نہیں ہوا تھا، اسی لئے ریاستیں ہمیشہ بغاوت کرتی رہتی تھیں۔ مبارک شاہ کی بد اخلاقیوں اور برائیوں سے تنگ آ کر دہلی کے امرا نے غیاث الدین تغلق کو (جس کا باپ ترک اور ماں جاٹنی تھی) اپنا بادشاہ

بنا لیا۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ دکھنی ریاستیں کہنا نہیں مانتیں تو اپنے بھتیجے الغ خان کو دکن کی طرف روانہ کیا۔ الغ خان نے دیوگڑھ پہ قبضہ کیا اور بیدر کو فتح کر کے سیدھا ورنگل کا رخ کر کے ۱۳۲۳ء میں آخری کاکا تیہ راجہ کو گرفتار کر کے ورنگل کا سلطنت ہند میں الحاق کر لیا۔

۶۔ جب الغ خان محمد بن تغلق شاہ کے خطاب سے تخت پر بیٹھا تو اس نے یہ سوچا کہ دہلی کی حکومت صرف ہندھیاچل تک پھیلی ہوئی تھی اُس وقت تو دہلی سلطنت کے گویا وسط میں واقع تھی لیکن اب جب تمام دکن اور جنوبی ہندوستان متحد ہو چکے ہیں تو دہلی کا اس حصے پر کافی قابو نہیں ہو سکتا، جس کی وجہ سے دکن میں ہمیشہ بغاوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ الغرض اس نے حکم دیا کہ دیوگڑھ میں سلطنت کے پایۂ تخت کے شایاں شان محلات، سڑکیں، ٹکسالیں اور دوسری عمارتیں بنائی جائیں اور اس کا نام بدل کر دولت آباد رکھ دیا جائے۔ پھر اس نے دہلی والوں کے مکانات کا انہیں پورا معاوضہ دے کر حکم دیا کہ اب آیندہ پائے تخت دولت آباد ہوگا اور چونکہ تمھاری برابر میرا کسی پر اعتبار نہیں اس لئے سب دولت آباد جا کر وہاں اس روپیہ سے اپنے مکانات بنواؤ۔ لیکن جب سلطان نے اپنا پائے تخت منتقل کر دیا تو بجائے جنوب کے شمالی ہندوستان میں بغاوتیں ہونے لگیں اور آخر کار اسے پھر اپنے پورے لاؤ لشکر کے واپس دہلی آنا پڑا۔

۷۔ محمد تغلق بعض لحاظ سے ہندوستان کے بڑے بھاری حکمرانوں

میں شمار ہوتا ہے ۔ وہ یقیناً اپنے زمانے کا سب سے عالم و فاضل بادشاہ تھا، اور اس نے چاٹگاؤں سے لے کر کرناٹک کا تمام علاقہ فتح کر کے اپنے ماتحت متحد کر لیا تھا؛ نیز ساتھ ہی ڈاک اور سڑکوں کا بہترین انتظام کر کے اپنے ملک میں ایک حد تک امن و اماں قائم کر لی تھی۔ لیکن اس کی سلطنت اس قدر وسیع ہو گئی تھی کہ اس کا انتظام قائم رکھنا مشکل تھا، اس لئے وہ دولت آباد جاتا تھا تو شمال میں بغاوت ہوتی تھی اور دہلی میں رہتا تھا تو دکھنی ہتیار اٹھاتے تھے ۔ آخرکار جب اس نے پایۂ تخت مستقل طور پر دہلی منتقل کر لیا تو دولت آباد کے مسلمان عہدہ دار قطعی طور پر باغی ہو گئے اور اسے آزاد کرا کر ہی مانا۔

دوسرا حصہ

زمانۂ وسطیٰ

(سنہ ۱۳۴۵ء تا سنہ ۱۷۲۴ء)

باب ۶

دکن کی آزادی ۔ حصۂ اوّل

(۔۔۔۔۔۔ ۱۳۴۵ء تا ۱۳۴۹ء ۔۔۔۔۔۔)

---

۱ ۔ دولت آباد کی بغاوت سے دراصل دکن کی تاریخ کا ایک نیا زمانہ شروع ہوتا ہے، اس لئے کہ یوں تو سلطان علاءالدین خلجی کے زمانے ہی سے دہلی والوں نے دکن ہی نہیں بلکہ جزیرہ نماۂ ہند کے اکثر حصوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن ان کی حیثیت اس وقت محض حملہ آوروں کی تھی ۔ اس بغاوت کے بعد دکن میں ایک مستقل سلطنت بن گئی جس کا اثر گوداوری اور کرشنا کے وادیوں تک پھیل گیا اور جس کی باجگزار وقتاً فوقتاً تمام باقی ماندہ جنوبی سلطنتیں ہوتی گئیں ۔

۲ ۔ محمد تغلق کی سختیوں اور دکن کے دہلی سے بہت دور واقع ہونے کی وجہ سے سلطان امورِ دکن پر کافی قابو یافتہ نہ تھا، اس لئے دکن کے امراء نے بغاوت کا جھنڈا اٹھا کھڑا کیا اور دولت آباد میں، جو اس وقت دکن کے صوبوں کا صدر مقام تھا، سب نے جمع ہو کر اتفاق رائے سے اپنے میں ایک امیر اسمٰعیل مُخ کو سلطان ناصر الدین اسمٰعیل

کے خطاب سے دہلی کے دکھنی صوبوں کا پہلا خودمختار سلطان منتخب کیا۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ گو اس بادشاہ کے فوج میں افغان، مغل، راجپوت، دکھنی، سب ہی تھے اور سب ہی نے اس کی اطاعت کا وعدہ کیا تھا، لیکن خود بادشاہ نہایت ضعیف اور بوڑھا تھا اور یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ سلطان محمد تغلق آسانی سے دکن کے صوبوں کو اپنی سلطنت سے علیحدہ ہونے دے، چنانچہ اس نے ایک بڑی فوج سرکشوں اور باغیوں کے خلاف دکن بھیجی۔ ادھر ورنگل بھی باغی ہوگیا تھا اور وہاں کے راجہ نے دولت آباد والوں سے اتحاد کرلیا تھا۔ اس متحد فوج کو لے کر امیر ظفر خاں آگے بڑھا اور اس نے تغلق افواج کو شکست دے کر اسے دہلی واپس جانے پر مجبور کیا۔ اس فتح سے ظفر خاں کا اثر بہت کچھ بڑھ گیا، اور جب سلطان ناصر الدین اسمٰعیل نے دیکھا کہ میں ان مشکلات کا سامنا نہیں کرسکتا جو دکھنی سلطنت کو پیش آنے والی ہیں تو اس نے اپنی خوشی خاطر امرا کی ایک نئی مجلس طلب کی اور اس کے سامنے سلطنت سے اپنا استعفا پیش کرکے کہا کہ بھائیو میرے نزدیک تو ظفر خاں سے بہتر کوئی شخص سلطنت کو نہیں سنبھال سکتا، اور میں بوڑھا بھی ہوگیا ہوں لہٰذا مناسب ہے کہ تم انہیں کو اپنا بادشاہ مقرر کرلو۔ الغرض ظفر خاں "سلطان علاء الدین حسن گنگو ہی بہمنی" کے نام سے دکن کے تخت پر بیٹھ گیا اور دولت آباد کی جگہ اپنی جاگیر گلبرگہ کو اپنا پایۂ تخت بنالیا۔

۳۔ اس نئے بادشاہ کا قصہ بھی عجیب و غریب ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا اصلی نام حسن تھا اور کسی زمانے میں یہ دہلی کے ایک برہمن کا نوکر تھا، جس کا نام گنگو تھا۔ یہ حسن شروع ہی سے نہایت ایمان دار اور نہایت دیانت دار تھا۔ اس کے آقا نے اسے ایک ہل اور دو بیل دئیے کہ تم میرے اس کھیت میں ہل چلاؤ۔ ہل چلا رہا تھا کہ اس کا ہل کسی چیز میں کھٹ سے لگا۔ دیکھا تو یہ اشرفیوں کی بھری ہوئی ایک دیگچی ہے۔ حسن کمال ایمان داری اور دیانت سے اس دیگچی کو اپنے آقا کے پاس لے گیا اور سب کی سب اس کو دے دیں۔ اس کا گنگو کے دل پر بہت اثر ہوا اور جب رفتہ رفتہ یہ خبر شاہی محلات میں پہنچی تو بادشاہ نے اس کی بہت قدر کی اور اسے اپنی سلطنت کا منصب دار مقرر کر دیا۔ حسن نے اپنی محنت اور ایمان داری سے اتنی ترقی کی کہ آخر وہ سلطنت کے امرا میں سے گنا جانے لگا اور جب سلطان محمد تغلق چند امرا کو دکن بھیج رہا تھا تو منجملہ دوسروں کے اس کی نظر حسن پر بھی پڑی۔ دکن پہنچنے پر پہلے تو اسے ظفر خاں کا خطاب عطا ہوا اور آخر کار (جیسا تم نے ابھی پڑھا ہے) وہ دکن کا بادشاہ بن گیا۔ دیکھو وہ کیسا اچھا آدمی تھا کہ اس عظیم الشان عہدے پر پہنچنے کے بعد بھی وہ اپنے پرانے آقا گنگو برہمن کو نہیں بھولا اور اپنے نام کے ساتھ اس کا نام بڑھا کر اپنا خطاب سلطان علاء الدین حسن گنگو بہمنی رکھا۔

۴۔ سلطان علاء الدین حسن سے کسی نے پوچھا کہ حضور کے عروج اور ترقی کے اصلی اسباب کیا تھے تو اس نے جواب دیا کہ بھائی میں نے مروّت اور سخاوت کو اپنے اوپر لازم کر لیا تھا اور میں اپنے دوست اور دشمن سب کے ساتھ مروّت سے پیش آتا تھا۔ ذکر ہے کہ دکن آنے سے پہلے ایک روز وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے پاس حاضر ہوا۔ حضرت کا اس روز روزہ تھا اور افطار کے لئے کچھ روٹیاں رکھی تھیں۔ انھوں نے ازراہِ لطف و کرم ان میں سے ایک روٹی لے کر اسے دی اور کہا کہ تیری عادات و اطوار ایسی ہیں کہ کسی روز تو ضرور بادشاہ بن جائے گا" اور اس روٹی کو تو اپنا چترِ شاہی سمجھ۔ دیکھو آج تک ہمارے بادشاہ اعلیحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کے علَم پر جو روٹی بنی ہوئی ہے وہ اس روٹی کی یادگار ہے اس لئے کہ وہ دکن کا پہلا مستقل بادشاہ تھا اور اُس وقت سے آج تک خدا کے فضل سے یہاں کوئی نہ کوئی مسلمان حکمران ضرور رہا ہے۔

۵ — وہ مذہباً مسلمان ضرور تھا لیکن اپنی تمام رعایا کو عزیز رکھتا تھا اور اس کا پہلا وزیر مال تو اس کا قدیم آقا گنگو ہی تھا۔ اس کے بعد اس کا ہمیشہ یہ قاعدہ رہا کہ کم سے کم وزیر مال تو ضرور کسی ہندو ہی کو مقرر کرتا۔ اس کی سلطنت بحیرۂ ہند سے لے کر موجودہ نظام آباد اور برار تک پھیلی ہوئی تھی" اور اسی کے زمانے میں دہلی کے بادشاہ فیروز تغلق نے (جو محمد تغلق کے بعد تخت نشین ہوا تھا) آخر کار دکن کی آزادی کو

تسلیم کر لیا۔ اس کے وزیر اعظم کا نام ملک سیف الدین غوری تھا، جس نے اپنے آقا اور اس کی اولاد اور اولاد در اولاد کی نہایت وفاداری سے خدمت کی اور آخر کار بوڑھا ہو کر چار بہمنی بادشاہوں کے زمانے میں وزارت کرنے کے بعد ایک سو سات برس کی عمر میں انتقال کیا۔

۲۔ علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ اول تخت دکن پر بیٹھا اور اس نے پورے پندرہ برس تک سلطنت کی۔ اس کے زمانے میں بہمنی سلطنت کو خوب ترقی ہوئی اور پایۂ تخت گلبرگہ میں بڑی بڑی نفیس عمارتیں بنیں جن میں وہاں کے قلعہ کی جامع مسجد اس وقت تک موجود ہے اور اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ اگر تم کبھی گلبرگہ جاؤ تو اس مسجد کو ضرور دیکھنا۔ اس نے گولکنڈے تک کا علاقہ راجۂ تلنگانہ سے فتح کر لیا اور جب بکا رائے فرمانروائے وجیانگر نے بغاوت کی تو اس پر چڑھائی کر کے اسے نیچا دکھایا۔ بات یہ ہے کہ یہ بہمنی بادشاہ سب کے سب اپنے آپ کو سلطان محمد تغلق کے تمام دکھنی قلمرو کا وارث سمجھتے تھے اور جس طرح علاء الدین اور محمد تغلق نے تمام جزیرہ نما فتح کر لیا تھا اسی طرح وہ ان راجاؤں کو اپنا باجگزار خیال کرتے تھے۔ لیکن ورنگل کے راجہ اور وجیانگر کے رائے دونوں کا ہمیشہ یہ طریقہ تھا کہ جب بہمنی تخت پر کوئی زبردست سلطان بیٹھ کر انہیں مجبور کرتا تو اس وقت وہ فوراً جتنا خراج ان پر عائد ہوتا تھا وہ ادا کر دیا کرتے ورنہ یہ اپنے گھر بیٹھے وہ اپنے گھر۔ جب محمد شاہ نے دیکھا کہ بکا رائے فرمانروائے وجیانگر خراج ادا

نہیں کرتا تو اس نے اس کے پایۂ تخت پر چڑھائی کی اور اپنا خراج لیے بغیر واپس نہ آیا۔ اس مہم میں سلطان نے اس قدر کشت و خون اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اس نے طے کر لیا کہ آئندہ فتح کے بعد میں کبھی قیدیوں کو تہ تیغ نہیں کروں گا" اور کم سے کم دکن میں مدت دراز تک اسی پر عمل ہوتا رہا۔ محمد شاہ نے ایک کام یہ بھی اچھا کیا کہ شیخ عین الدین رح کے کہنے سے نہ صرف خود شراب جیسی ناپاک اور نجس چیز سے توبہ کی بلکہ شراب سینڈھی کے جتنے کارخانے تھے سب کو مسمار کر دیا اور آئندہ حکم دے دیا کہ ہماری قلمرو میں کوئی شراب نہ بنائے نہ بیچے نہ پیئے۔

مجاہد شاہ

۷۔ محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا مجاہد شاہ تخت پر بیٹھا۔ اس نے بکا رائے سے کہلا بھیجا کہ یہ مناسب نہیں کہ ہمارے اور آپ کے درمیان لڑائی جھگڑے ہوا کریں، اس لئے بہتر ہوگا کہ آپ اور ہم مل کر سرحد مقرر کر لیں اور دریائے تنگ بھدرا کو حد فاصل قرار دے لیں۔ بجائے اس کے کہ رائے اسے منظور کرے اس نے جواب دیا کہ نہیں، آپ ہمیں مدگل اور رائچور دے دیجئے اور آئندہ سرحد دریائے کرشنا پر ہونی چاہیئے۔ اس پر سلطان بگڑ گیا اور تنگ بھدرا کو پار کر کے علاوہ شہر وجیانگر کے تمام ریاست کو تاراج کر دیا" اور چونکہ اس زمانہ میں وجیانگر والے تمام جنوبی ہند پر حاوی تھے اس لئے سلطان نے بھی جنوب کا کوئی کونا نہ چھوڑا۔ اس مہم میں ایک خاص بات ذکر کرنے کے قابل یہ ہے کہ ادھونی کے معرکے کے وقت سلطان نے اپنے دشمن کے خلاف توپوں کا استعمال کیا جس سے معلوم

ہونا ہے کہ اس زمانے کے دکھنی آلات جنگ میں کتنے بڑھے ہوئے تھے۔
افسوس کہ مجاہد اس جنگ سے واپس نہیں آیا بلکہ میدان جنگ میں
خود اپنے ہی رشتہ داروں اور افسروں کی سازش کا شکار ہوا۔

۸ ۔ مجاہد شاہ کے بعد اس کا چچا یعنی محمد شاہ کا بھائی سلطان داؤد شاہ
تخت نشین ہوا۔ لیکن اس کی حکومت زیادہ دن تک نہیں رہی بلکہ داؤد شاہ
مرحوم سلطان مجاہد کی بہن شہزادی روح پرور آغا نے اپنے بھائی کے
قتل کا بدلا لیا اور کسی دوسرے کے ہاتھ داؤد کو ملک عدم پہنچا کر اس
کے بھائی سلطان محمود شاہ اول کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ سلطان اپنی نیکی محمود شاہ اول
اور علم پروری کی وجہ سے تمام بہمنی سلاطین میں ممتاز ہے اور اس نے اپنی
انیس برس کی حکومت میں بجائے سازشوں اور لڑائی جھگڑوں کے نہایت
امن و امان سے حکومت کی اور ملک والوں کی ترقی کے لئے کوئی بات
اٹھا نہیں رکھی۔ وہ خود عربی فارسی کا عالم تھا اور قرآن مجید نہایت
خوش الحانی اور قرأت سے پڑھتا تھا اور عالموں کی نہایت قدر کرتا تھا۔
اس نے تخت پر بیٹھنے سے پہلے تو دوسرے شہزادوں کی طرح نہایت
عیش و آرام کے ساتھ زندگی بسر کی تھی لیکن جب یہ بادشاہ ہوا تو اس
نے کہا کہ میں تو اپنے پیارے ملک والوں کا صرف ایک خزانہ دار ہوں،
مجھے کیا حق ہے کہ اپنے اوپر زیادہ روپیہ صرف کروں، چنانچہ وہ نہایت
سادہ کپڑے پہننے لگا اور نہایت سادہ طور سے رہنے لگا، اور جو روپیہ
اس طرح سے جمع ہوا اس سے اس نے اپنی عظیم الشان سلطنت کے

گاؤں اور قصبوں میں سرکاری مکتب کھول دئے اور بڑے بڑے شہروں جیسے ڈابھیل، دولت آباد، ایلچ پور، قندھار، بیدر، جنیر میں بڑے بڑے مدارس کا افتتاح کیا۔ اس کی علم دوستی کی شہرت دور دور پہنچی یہاں تک کہ اس کی خواہش پر فارس کے مشہور و معروف شاعر خواجہ حافظ شیرازیؒ نے سرزمین دکن آنے کا قصد کیا، اور اگر وہ سمندر کے تھپیڑوں سے گھبرا نہ جاتے تو وہ یہاں ضرور آتے۔ سلطان محمود کو اپنی رعایا کا اتنا خیال تھا کہ جب اس کی سلطنت میں قحط پڑا تو اس نے دور دراز ملکوں سے غلہ خرید خرید کر نہایت کم داموں میں اپنی عزیز رعایا کو فروخت کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کی اور اس کے موروثی وزیر ملک سیف الدین غوری کی موت سے (جس کا اس کے صرف ایک دن بعد انتقال ہوا) دکن کو جو صدمہ پہنچا اس کی تلافی ناممکن تھی، اور مدت تک یہ سرزمین بدامنی کا شکار بنی رہی۔

غیاث الدین بن محمود شاہ

شمس الدین بن محمود شاہ

۹ ۔ محمود شاہ کے بعد پہلے اس کا ایک بیٹا سلطان غیاث الدین اور اس کے بعد دوسرا بیٹا سلطان شمس الدین یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے، لیکن ان دونوں کو بہت دن تک جاہ و جلال دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔ اس لئے کہ ملک سیف الدین غوری کے انتقال کے بعد حکومت میں سازشوں کا بازار گرم ہو گیا تھا اور امراء چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح سے یہ خود قوی ہو جائیں چاہے سلطنت کا حال کیسا ابتر ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ان بدبخت بدخواہوں نے ان دونوں شہزادوں کے

ساتھ نہایت برا سلوک کیا اور انہیں قید کرکے داؤد شاہ کے بیٹے سلطان فیروز شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

۹۔ سلطان فیروز شاہ بہمنی کے عہد حکومت میں بھی اس کے چچا محمود شاہ اول کی طرح دکن نے بہت کچھ نام پیدا کیا۔ یہ بھی بڑا علم دوست تھا اور عالموں کی صحبت کو پسند کرتا تھا۔ یہ اکبر اعظم کی طرح (جو اس سے دو سو سال بعد دہلی کا شہنشاہ ہوا) ہر مذہب کے پیروؤں سے پوری رواداری برتتا تھا اور اس کے دربار سے ہر مذہب کے پیشواؤں کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ اس نے ستاروں، سورج، اور چاند کا مطالعہ کرنے کے لئے دولت آباد میں ایک رصدگاہ بنائی اور اس پر بڑے بڑے عالموں کو مقرر کیا۔ وہ خود بھی بہت کچھ پڑھا لکھا تھا اور کئی زبانوں میں نہایت آسانی سے بول سکتا تھا۔ باوجود اپنی مصروفیت کے ہفتہ میں وہ تین روز خود طالب علموں کو سبق پڑھاتا تھا۔ پھر یہی نہیں کہ قلم پر ہی حاوی ہو بلکہ تلوار پر بھی اسے کافی قابو حاصل تھا۔ اس نے وجیانگر، تلنگانہ، اور گونڈوانہ میں متعدد مہمیں سر کیں اور ان میں سے اکثر میں کامیاب ہوا۔ اس کے عہد میں بہمنیوں کی شہرت دور دراز مقامات میں پھیلی اس لئے کہ اول تو اس سلطنت کے جہاز گووا اور چول سے مغربی ممالک کو جاتے تھے اور دوسرے سلطان نے تیمور لنگ کے دربار میں خاص طور سے ایک سفارت بھیجی تھی۔ امیر تیمور اس زمانہ کا بہت ہی بڑا بادشاہ تھا اور ایشیا کا اکثر

حصہ اس کا مطیع ہو چکا تھا۔ اس نے دہلی پر بھی حملہ کیا تھا اور اپنی طرف سے ایک صوبہ دار خضر خاں کو دہلی میں چھوڑا تھا۔ جب فیروز شاہ بہمنی نے اپنا سفیر بھیجا تو تیمور نے اس کی بڑی خاطر تواضع کی اور فیروز شاہ کی آزادی کو تسلیم کرنے کے بعد بہت کچھ تحفے تحائف دے کر سفیر کو رخصت کیا۔

فیروز شاہ کے متعلق اب صرف یہی بات کہنی ہے کہ اس کے زمانے میں دکن میں ایک ایسی رسم شروع ہوئی جس کا بہت سے دکھنی بادشاہوں نے اور دو سو برس بعد خود اکبر اعظم شہنشاہ ہند نے اتباع کیا، یعنے اس نے نہ صرف خود دیورائے فرمانروائے وجیانگر کی بیٹی سے (جو ہندنی تھی) نکاح کیا بلکہ اسی طرح اپنے بیٹے حسن خاں کا نکاح بھی پرتھال نامی ایک خوبصورت برہمنی کے ساتھ کر دیا۔

۱۰ ۔ فیروز شاہ کے بعد اس کا چھوٹا بھائی احمد شاہ "ولی" بہمنی تخت پر بیٹھا۔ یوں تو فیروز شاہ کا بیٹا حسن خاں بھی تھا لیکن اس میں بہت بری بری عادتیں تھیں اور وہ بجائے محنت کرنے اور ملک کا انتظام کرنے کے عیش و عشرت میں پڑ گیا تھا، اس لئے جو شخص تخت کا مستحق تھا اور جو ایسا نیک تھا کہ ہمیشہ کے لئے "ولی" مشہور رہا، وہی تخت پر بیٹھا۔ صرف یہی نہیں کہ مسلمان ہی اسے ولی سمجھتے ہوں بلکہ ہندوؤں میں بھی وہ اتنا ہی مقبول تھا، اور آج بھی سال میں ایک دفعہ جب اس بادشاہ کا عرس ہوتا ہے تو گلبرگہ کا ایک پنڈت ہی اس کے مقبرے کا دروازہ کھولتا اور سنکھ بجاتا ہے۔ آج گلبرگہ جس وجہ سے تمام ہندوستان

میں اتنا مشہور ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کا مزار ہے۔ آپ اس ولی منش بادشاہ کے عہد میں گلبرگہ میں رہتے تھے اور اس نے ان کے لئے ایک خانقاہ، مسجد اور مدرسہ بنوایا تھا بلکہ کہتے ہیں کہ کہ یہ انھی کی دعا کا اثر تھا کہ احمد شاہ بادشاہ بنا۔

۱۱۔ احمد شاہ نے تین بڑی بڑی مہمات سر کیں، ایک وجیانگر کے خلاف، ایک ورنگل کے خلاف اور ایک گونڈوانے کے خلاف۔ وجیانگر کے حکمراں دیورائے نے اور ورنگل کے راجہ نے خراج ادا نہیں کیا تھا۔ اس لئے احمد شاہ نے وجیانگر پر چڑھائی کر کے رائے کو خراج گزاری پر مجبور کیا، اور ورنگل کے راجہ کو شکست دے کر آخر کار اس کی ریاست کو اپنی سلطنت میں ملا لیا۔ کہتے ہیں کہ احمد شاہ گونڈوانے کی مہم سے واپس آرہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ ایک کتا ایک لومڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔ یکایک لومڑی کھڑی ہو گئی اور الٹی کتے پر حملہ آور ہوئی اور اسے آخر بھگا ہی دیا۔ احمد شاہ کی دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ سرزمین بیدر کی ہے تو اس نے کہا کہ جب یہاں کے جانور ایسے مضبوط ہوتے ہیں تو یقیناً یہاں کی آب و ہوا میں کوئی خاص تاثیر ہوگی چنانچہ اس نے اپنا پائے تخت حسن آباد گلبرگہ سے بیدر منتقل کر دیا اور اس قدیم شہر کا نام بدل کر اپنے نام پر احمد آباد بیدر رکھ دیا۔ پائے تخت منتقل ہوتے ہی احمد شاہ نے قلعہ، جامع مسجد اور خوبصورت ایوان تعمیر کئے جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

باب ۷

دکن کی آزادی ۔ حصّہ دوم

(۱۴۳۹ء تا ۱۵۲۶ء)

---

۱ ۔ سلطان احمد شاہ ولی کے انتقال کے بعد اس کا بڑا بیٹا علاء الدین دوم تخت پر بیٹھا ۔ اس نے بیس برس تک سلطنت کی ۔ علاء الدین میں بہت سی خوبیاں تھیں ۔ جب اس کے چھوٹے بھائی شہزادہ محمود نے بغاوت کی اور اس بغاوت میں اسے ناکامی ہوئی تو علاء الدین نے نہایت دریا دلی کے ساتھ اس کا قصور معاف کر دیا اور اسے بجائے سزا دینے کے تلنگانہ کا صوبہ دار مقرر کر دیا ۔ پھر اس نے دارالسلطنت بیدر میں ایک بہت بڑا شفاخانہ تعمیر کرایا اور اس کے لئے بہت سے گاؤں وقف کئے جن کی آمدنی سے مریضوں کو صرف دوا ہی نہیں بلکہ غذا بھی بالکل مفت دی جاتی تھی ۔ اس نے جوا کھیلنا (جس سے خاندان تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں) اور شراب جیسی ناپاک چیز چھونا یا پینا (جس سے انسان پاگل ہو جاتا ہے اور اسے کسی چیز کا تمیز نہیں رہتا) بالکل ممنوع کر دیا تھا اور کہتے ہیں

کہ خواہ اس کا کوئی ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہو جاتا یہ کبھی عدل و انصاف میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتا تھا۔ اس بادشاہ کا اصول یہ تھا کہ ہر شخص کو اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے کھانا کھانا چاہیئے اور کسی کو یہ حق نہیں کہ خود تو کاہل رہے اور دوسروں کی گاڑھی کمائی میں حصہ دار بنے، چنانچہ اسی لئے اس نے مفلس خانے بنائے تھے جس میں وہ سب ہٹے کٹے کہ جنہیں خدا نے ہاتھ پاؤں دیئے ہوں لیکن وہ اس کا استعمال کئے بغیر مانگتے پھرتے ہوں، رکھے جاتے تھے اور ان سے کام لیا جاتا تھا۔

۲۔ علاء الدین کو اپنے دو ہمسائیوں سے لڑائیاں لڑنی پڑیں ایک تو خاندیش سے اور دوسری وجیانگر سے۔ بادشاہ نے ایک تو سلطان خاندیش کی بیٹی سے نکاح کیا تھا جس کا خطاب ملکۂ جہاں تھا، اور دوسری اس کے ایک ہندو ملکہ بھی تھی جس کا خطاب پری چہرہ تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان شادی بیاہ کا اصول سب سے پہلے دہلی کے مغل بادشاہ اکبر اعظم نے نکالا تھا، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس بادشاہ سے بہت پہلے یہ طریقہ دکن میں رائج ہو چکا تھا۔ بہرحال جب حاکم خاندیش نے دیکھا کہ سلطان ملکہ پری چہرہ کی طرف زیادہ مائل ہے تو اس نے بہمنی ملک پر حملہ کر دیا، لیکن اس کا بالکل الٹا اثر پڑا اور سلطان کے مقبل سپہ سالار ملک التجار نے خاندیش کے دارالسلطنت برہان پور پر قبضہ کر لیا۔

۴ ۔ لیکن وجیانگر کے ساتھ جنگ میں بادشاہ کو بہت دقت پیش آئی ۔ کہتے ہیں کہ ایک روز دیورائے دوم فرمانروائے وجیانگر نے اپنے بڑے بڑے سرداروں اور پنڈتوں کو بلا کر دریافت کیا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جب کبھی میرے ملک اور سلطنت دکن کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو میرے ملک ہی کو نیچا دیکھنا نصیب ہوتا ہے ۔ اس کے جواب نے اس کے جوتشیوں اور پنڈتوں نے تو یہ جواب دیا کہ مہاراج ہم کیا کریں مسلمانوں کا اقبال یاور ہے اور آج نہیں بلکہ ہمیشہ ان کی ہم پر فتح رہے گی ۔ لیکن ظاہر ہے کہ امراء اور سردار اس جواب کو کیسے پسند کر سکتے تھے ؟ ان کا جواب یہ تھا کہ نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان ہم ہندؤں سے کہیں زیادہ بہادر ہیں اور انھیں جنگ کا فن بخوبی آتا ہے ۔ ان دونوں جوابوں کو سن کر رائے نے حکم دیا کہ اچھا آج سے ہم اپنا طریقہ بدلے دیتے ہیں اور آج کے بعد ہم مسلمانوں کو ہندؤں کے برابر جگہہ دیں گے اور ان کے مذہب کو اپنے راج میں پوری آزادی دیں گے ۔ اس نے خاص پائے تخت میں ایک مسجد بنوائی اور اپنے تخت کے برابر قرآن مجید کی ایک جلد رکھوا دی تاکہ مسلمان جب جھکیں تو اپنے خیال کے مطابق کسی ہندو راجہ کے تخت کے سامنے نہیں بلکہ قرآن مجید کے سامنے جھکیں ۔ بہرحال ان اصلاحات اور اس رواداری سے (جو اس سے پہلے وجیانگر میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی) اس سلطنت کی قوت بہت بڑھ گئی ، لیکن اس کے باوجود بھی اس کا

لشکر علاء الدین کے افسروں اور سپاہیوں کی ترکیبوں اور بہادری کی تاب نہیں لا سکا، اور جب دیورائے کی ہندو مسلم فوج نے رائچور کا محاصرہ کیا تو ملک التجار کے حملے کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑا۔ آخر کار دونوں فریقوں کے درمیان صلح ہوگئی اور جب تک علاء الدین نے حکومت کی اس وقت تک آپس کی دوستی میں کبھی فرق پیدا نہیں ہوا

۴ ۔ علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں شاہ بہمنی تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانے میں اول تو "دکھنیوں" اور آفاقیوں کے درمیان بڑے بڑے فسادات ہوئے اور ملک میں متعدد بغاوتیں ہوئیں جن کا بادشاہ نے نہایت ہی سختی کے ساتھ انسداد کیا۔ دوسرے اس کا عہد اس لئے بھی ممتاز ہے کہ اس کے ہی زمانے میں دو تین ایسے ایسے لوگ معاملات سلطنت میں پیش پیش ہوئے جن پر سرزمین دکن جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ اس کے زمانے میں ایک "آفاقی" محمود گاواں بیجاپور کا طرف دار (یعنی صوبہ دار) اور وکیل شاہی تھا اور اسی بادشاہ کی ملکہ مخدومہ جہاں نرگس بیگم وہ طباع اور ذہین عورت تھی جس نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد سال ہا سال تک بہمنی تخت سنبھالا اور اسے دشمنوں سے بچائے رکھا۔ پھر دو نام اور سننے میں آتے ہیں، ایک تو یوسف عادل خاں ترک کا (جو بعد میں چلکر یوسف عادل شاہ والئی بیجاپور بنا) دوسرے سلطان کے بہنوئی سلطان قلی قطب الملک کا جو بعد میں چلکر گولکنڈے کا پہلا قطب شاہی فرمانروا بنا۔

۵ - ہمایوں شاہ صرف تین برس حکومت کر کے راہی ملک عدم ہوا اور اس کے بعد اس کا نوعمر لڑکا نظام شاہ بہمنی تخت پر بیٹھا۔ اس کی نوعمری سے فائدہ اُٹھا کر سلطان مالوہ نے دکن پر حملہ کر دیا اور تقریباً تمام سلطنت پر قبضہ کر کے خاص شہر بیدر تک تمام ملک لے لیا جس کے بعد صرف قلعہ بیدر سلطان کے قبضہ میں رہ گیا۔ اپنے پیارے ملک کی آزادی کے خاطر ملکہ مخدومہ جہاں اور محمود گاواں وزیر سلطنت نے جو بہادری کے جوہر دکھائے وہ سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں اور آخر کار مالوہ والوں کو واپس ہی چلا جانا پڑا۔ لیکن نظام شاہ کی عمر نے وفا نہیں کی اور عین اپنی شادی کی رات کو یکایک اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا چھوٹا بھائی سلطان محمد شاہ دوم تخت پر بیٹھا اور پورے بیس سال حکومت کی۔ سلطان کی عمر صرف نو برس کی تھی اور ملکہ مخدومہ جہاں اور خواجہ محمود گاواں نے اس کی تعلیم و تربیت کے لئے تجربے کار عالم و فاضل بلا کر نوکر رکھے تاکہ وہ آئندہ بہترین طرز پر حکومت کرنے کے قابل ہو جائے۔ اس کی نوعمری کے زمانے میں حکومت تین شخصوں کے قبضے میں تھی، ایک ملکہ مخدومہ جہاں، دوسرا خواجہ جہاں (جس کا اصلی نام ملک شاہ تھا) اور تیسرا محمود گاواں، چنانچہ خواجہ جہاں اور ملکہ مخدومہ جہاں کی وفات کے بعد حکومت کی باگ کلیتہً خواجہ محمود گاواں کے قبضے میں آگئی، جس نے اپنے قلم اور اپنی تلوار دونوں کے ذریعے سے سلطنت دکن کا نام دور دور تک مشہور

کر دیا اور مولانا جامیؒ جیسے بزرگ شاعروں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے۔

محمود گاواں کا زمانہ سلطنت دکن کے انتہائے عروج کا زمانہ سمجھنا چاہیئے، اس لئے کہ اس عہد میں اوڑیسہ اور مچھلی بندر سے گووا بندر تک سب کے سب ملک پر بہمنی علم اڑتا تھا، اور شمال میں برار اور جنوب میں ملیگاؤں اسی عظیم الشان سلطنت میں ملا لیا گیا تھا۔ اس عہد میں سلطنت اتنی وسیع ہوئی کہ چار کے بجائے اس کے آٹھ اطراف یعنی صوبے بنا دئے گئے۔ تاکہ ملک میں خاطر خواہ انتظام ہو سکے۔

۱۔ لیکن باوجود اس وسعت ملک اور حسن انتظام کے ملک کو "دکھنی" "آفاقی جھگڑوں کی دیمک نے کھا لیا تھا" اور گو محمود گاواں نے (جسے ملک شاہ کے انتقال کے بعد "خواجۂ جہاں" کا خطاب مل گیا تھا) اپنا تن من دھن سب دکن کے نذر کر دیا تھا، لیکن ایک فریق جو اپنے آپ کو "دکھنی" کہتا تھا، اس کے خلاف ہو گیا تھا۔ اس فریق کے رہنما کا نام امیر حسن نظام الملک بحری تھا۔ اس حسن کا دادا پاتری کا پٹواری تھا، اور چونکہ اس کے باپ کا نام بھیرو تھا اس لئے اس کے مسلمان ہونے کے بعد یہ "بحری" مشہور ہو گیا۔ اسی طرح اس فریق کا ایک رکن فتح اللہ عماد الملک تھا جو وجیا نگر کے راجوں کی اولاد سے تھا اور جو کسی زمانے میں لڑائی میں گرفتار ہو کر بیدر آیا تھا۔

خواجہ محمود گاواں اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کا سچا خیر خواہ تھا، اور جب اس نے دیکھا کہ جگہ جگہ امراء کو ضرورت سے زیادہ قابو حاصل ہو گیا ہے تو اس نے ملک کے انتظام کے لئے بڑی بڑی اصلاحیں کیں۔ پہلے تو طرف داروں (یعنی صوبہ داروں) کو فوج کی تنخواہ کے لیے بہت بہت بڑا منصب خزانہ شاہی سے ملا کرتا تھا اور اس کی مطلق نگرانی نہیں ہوتی تھی کہ اس منصب میں سے وہ فوج پر کتنا خرچ کرتے ہیں اور اپنے ذاتی عیش و عشرت پر کتنا، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ضرورت کے وقت کافی فوج مہیا نہیں ہو سکتی تھی۔ اب خواجہ نے طرف داروں کے منصب کی تعداد تو بڑھا دی لیکن ساتھ ہی ہر طرف دار کے متعلق جو سپاہی تھے ان کی تعداد مقرر کر دی اور یہ حکم دے دیا کہ جب کبھی کوئی سپاہی کم نکلے تو اس کی تنخواہ کے تعداد طرف دار کے منصب میں کم کر دی جائے۔ پھر شورہ پشت امیروں کے اقتدار میں کمی کرنے کے لئے اس نے سوائے ایک ایک مرکزی قلعہ کے باقی قلعہ جات قلعہ داروں کے سپرد کر دیئے جو طرف داروں کے نہیں بلکہ براہ راست سلطان کے ماتحتی میں آ گئے۔

۷۔ ظاہر ہے کہ ان اصلاحوں سے امراء کب خوش ہو سکتے تھے۔ لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ خواجہ ایک نہایت ایمان دار اور وفادار خادم سلطانی تھا، اور کوئی ایسی بات نہ کرتا تھا جس سے سلطان کے ماتھے پر ذرا بھی شکن آئے۔ اس کے برعکس اس کے علمی کاموں اور

اس کی جنگی مہمات کی وجہ سے بادشاہ اس سے بہت ہی خوش تھا۔ اس نے جو مدرسہ بیدر میں بنایا اور جیسے جیسے علمار و فضلا بیرون ملک سے چن چن کر اس میں درس دینے کے لئے بلوائے اس سے سلطنت دکن کی شہرت میں چار چاند لگ گئے اور آج تک اس مرحوم مدرسے کے در و دیوار، اس کے بڑے بڑے وسیع کمرے، اس کا واحد موجودہ مینار اور اس کے عظیم الشان کتب خانے کے عمارات سب نہ صرف خواجہ کے علم پروری بلکہ بیدر کے عظمت و وقعت کی شہادت دینے کے لئے باقی ہیں۔ وہ بادشاہ کو (جسے اس نے اپنی گودوں میں پالا تھا) اتنا عزیز تھا کہ ایک مرتبہ جب وہ ملیبار کے بحری قزاقوں کا خاتمہ کرکے اور گووا بندر کو فتح کرنے کے بعد واپس آیا تو بادشاہ اتنا خوش ہوا کہ خواجہ کے مکان پر آکر کئی روز رہا اور اسے طرح طرح کے تحفے تحائف اور خلعات فاخرہ سے مالا مال کیا۔ جب بادشاہ واپس محل چلا گیا تو وہ بہت رویا اور سوائے ہاتھیوں، گھوڑوں اور اپنی کتابوں کے باقی سب چیزیں خیرات کردیں۔ جب خواجہ سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے یہ کیا کیا، تو اس نے کہا کہ ہاتھی گھوڑے تو میرے آقا یعنی سلطان کے ہیں؛ رہیں کتابیں تو وہ غریبوں اور عالموں کے واسطے ہیں اور انہیں میں اپنی نہیں سمجھتا؛ باقی دولت ایسی چیز ہے کہ اس کی وجہ سے اس میں طرح طرح کی بری عادتیں پیدا ہوسکتی ہیں اور یہی بہتر ہے کہ اس سے غربا اور مفلسین کی مدد کی جائے۔

۸ ۔ بہرحال خواجہ کے اس اعزاز و اکرام سے بعض امرا کے دل میں اس کی طرف سے حسد کا دھواں اٹھا، اور جب انھوں نے دیکھا کہ خواجہ پر کسی طرح کا حرف نہیں لا سکتے اور اس نے خود بادشاہ کو اپنا بنا لیا ہے تو انھوں نے ایک ناپاک سازش کی اور اس کی طرف سے بادشاہ کے خلاف ایک جعلی خط بنایا، جس میں راجہ اوڑیسہ کو دکن پر حملہ کرنے کی گویا دعوت دی گئی تھی، اور یہ خط بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔ بادشاہ فوراً آگ بگولا ہو گیا اور خواجہ کو بلا کر کہا کہ خواجہ اگر کوئی اپنے مالک کے خلاف سازش کرے اس کی کیا سزا ہے، جس پر خواجہ نے کہا کہ حضور اس کی سزا موت ہے۔ اس پر بادشاہ نے وہ خط دکھایا تو خواجہ چلّا اٹھا کہ سرکار، یہ مجھ پر کسی بدبخت نے صریح بہتان باندھا ہے۔ مگر بادشاہ کو غصّے نے اندھا کر دیا تھا اس نے فوراً اس نیک نفس اور وفادار خادم قوم کی گردن مارنے کا حکم دے دیا اور اس طرح خواجہ محمود گاواں نے جام شہادت نوش کیا۔ بادشاہ کو اصل حالات اور اس کی عین وفاداری کی خبر اس وقت ملی جب اس نے خواجہ کے خزانچی کو بلا کر اس سے کہا کہ فوراً خواجہ کا خزانہ ہمارے سامنے لاؤ۔ خزانچی نے جواب دیا کہ جہاں پناہ خواجہ کے خزانے کے دو صیغے تھے، ایک کا نام خزانہ شاہی جس میں سے ہاتھی گھوڑوں کا خرچ چلتا تھا اور سپاہیوں کی تنخواہیں دی جاتی تھیں اور جس میں سے خواجہ اپنے اوپر ایک پیسہ خرچ نہ کرتا تھا۔ دوسرے صیغہ کو خزانۂ درویشاں کہتے تھے جس میں سے رفاہِ عام کے کام انجام پاتے

تھے اور غریبوں، مفلسوں، بیواؤں، مدرسوں، کلیوں کی مدد کی جاتی تھی۔ اس مد میں خواجہ کے انتقال پر صرف تقریباً ایک سو روپیہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ سلطان نے جب یہ سنا کہ خواجہ اپنے اوپر چار روپیہ روزانہ سے زیادہ صرف نہ کرتا تھا اور ہمیشہ چٹائی پر سوتا تھا تو وہ ششدر و حیران ہو گیا اور اپنے کردار پر نہایت ہی نادم ہوا، اور یہ محسوس کرنے لگا کہ میں نے لغو اور جھوٹی سازشوں کی وجہ سے ملک کی ایک بڑی ہستی کا خاتمہ کر دیا۔

۹۔ خواجہ کے انتقال کے ٹھیک ایک سال بعد عین جوانی کے عالم میں خود سلطان محمد شاہ دوم کا بھی انتقال ہو گیا، لیکن اس سے پہلے ہی دراصل خواجہ کے موت سے سلطنت دکن کے خاتمہ کے ابتدار ہو گئی تھی، اس لئے کہ امرار سوچنے لگے کہ جب ایسا وفادار اور ایسا جان نثار شخص بعض بدبخت سازشوں کا شکار ہو سکتا ہے تو ہمیں پھر اپنا اپنا گھر سنبھالنا چاہئے چنانچہ ان میں سے بعض ہوشیار امرار نے پہلے تو طرفداروں کی حیثیت سے اور پھر آزاد بادشاہوں کی حیثیت سے ملک کے مختلف حصوں پر قبضہ کر لیا۔

محمد شاہ کے بعد اس کا بیٹا محمود شاہ دوم تخت پر بیٹھا اور محمود گاواں کی جگہ ملک حسن نظام الملک بحری وزیر اعظم مقرر ہوا۔ لیکن یہ زیادہ دن تک وزیر نہیں رہا، اس لئے کہ اس کے مخالفوں نے اسے قتل کرا دیا اور اس کی جگہ شہر بیدر کے کوتوال قاسم برید نے لے لی۔

محمود شاہ ایک نہایت ہی کمزور حکمراں تھا اور بہت ہی جلد وہ قاسم برید کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی بن گیا، یہاں تک کہ اس کے اپنے ذاتی قبضے میں صرف ایک نہایت ہی چھوٹا سا علاقہ رہ گیا اور باقی ماندہ جو کچھ ملک جاگیرداروں اور امراء سے بچا تھا اس کا بھی قاسم برید گویا مالک بن بیٹھا۔ یہ ضرور ہے کہ نہ صرف محمود شاہ کے زمانے میں بلکہ اس کے تین جانشینوں یعنی احمد شاہ دوم، علاء الدین سوم، ولی اللہ اور کلیم اللہ کے عہد میں بھی ہر ایک امیر خود بادشاہ کی کمال وقعت اور عزت کرتا تھا اور جو کچھ بھی لڑائی جھگڑے تم بیدر اور ان جاگیرداروں کے درمیان دیکھو گے وہ دراصل قاسم برید اور اس کے جانشینوں سے سمجھنے چاہئیں۔ مثلاً جب قاسم برید کے بیٹے امیر برید نے محمود شاہ کو لے کر بیجاپور پر چڑھائی کی اور اس میں شکست پائی تو امیر برید تو بھاگ گیا لیکن بیجاپور کے فرمانروا اسمٰعیل عادل شاہ نے (جو بیجاپور کے پہلے بادشاہ یوسف عادل شاہ کا بیٹا تھا) محمود شاہ بہمنی کی ایسی خاطر کی جیسے کوئی ملازم اپنے آقا کی کرتا ہے اور آخر کار اپنی بہن بی بی ستی خانم کا نکاح بہمنی ولیعہد کے ساتھ کر دیا۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ان تمام امراء میں جنھوں نے علَمِ آزادی بلند کر دیا تھا علاوہ یوسف عادل شاہ کے اور کسی نے ابتدا میں اپنے نام کے ساتھ "شاہ" کے لفظ کا اضافہ نہیں کیا بلکہ بعض نے تو سلطان محمود شاہ کے انتقال تک برابر محض امیر سلطنت بہمنیہ رہنے پر اکتفا کیا۔

۱۰ - الغرض سب سے پہلے جس شخص نے شاہی خطاب اختیار کیا وہ یوسف عادل خاں طرف دار بیجاپور تھا، جس نے اپنی مربی خواجہ جہاں محمود گاواں کے انتقال کے بعد بیجاپور جاکر یوسف عادل شاہ کا خطاب اختیار کیا اور اس طرح وہ سلطنت قائم کی جو دوسو برس تک بڑی آب و تاب کے ساتھ دکن کی آزادی کو برقرار رکھے رہی۔ یوسف عادل شاہ ایک اعلیٰ درجہ کا تعلیم یافتہ شخص تھا اور شاعری، خوش نویسی اور موسیقی میں اسے کمال حاصل تھا۔ بیجاپور کے قلعہ ارک میں جو نفیس عمارتیں اس نے بنوائیں وہ آج تک زینت دکن بنی ہوئی ہیں۔ اس کے زمانے میں اس کی سلطنت گلبرگہ اور شولاپور سے گووا بندر اور کوکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب نرسمہا رائے فرمانروائے وجیانگر نے رائچور اور مدگل پر قبضہ کیا تو یوسف فوراً اس کی سرکوبی کے لئے گیا اور وہاں سے فاتح و ناصر واپس آنے پر محمود شاہ بہمنی کو طرح طرح کے تحفے تحائف بھیجے۔ اسی طرح ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بہادر گیلانی حاکم گووا نے بغاوت کی تو خود محمود شاہ اس کے خلاف گیا اور بغاوت فرو کرنے پر واپسی میں بیجاپور ہوتا ہوا پائے تخت بیدر آیا، تو اس مرتبہ بھی یوسف عادل شاہ نے اسے اور قاسم برید و قطب الملک کو تحفے تحائف سے مالا مال کردیا اور ساتھ ہی بادشاہ کو ایک بڑی رقم بالکل خفیہ اس لئے دی کہ قاسم برید اس پر قبضہ نہ کرلے۔ یوسف کے زمانہ کا ایک بڑا اہم واقعہ یہ تھا کہ ۱۴۹۸ء میں ایک پرتگیز جہاز راں واسکوڈاگاما نے

ایک مسلمان عبدالمجید کی رہنمائی سے راس امید سے ساحل ملیبار کا راستہ دریافت کیا، اور گوا سے دو تین مرتبہ شکست ہوئی لیکن آخر کار جب بیجاپور کی فوج یوسف کے انتقال کے بعد اسمٰعیل عادل شاہ کی سلامی کے لئے گئی ہوئی تھی اس وقت اس نے گووا بندر پر قبضہ کر لیا۔ اور وہاں پہلی یورپین تجارتی کوٹھی بنائی۔ یوں تو اتنے بڑے ملک میں کسی تجارتی دکان کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے، لیکن باوجود ابتدائی ناکامیوں کے ان فرنگیوں نے ہمت نہ ہاری" اور یہ نہیں تو ان کے بھائی بندوں یعنی انگریزوں اور فرانسیسیوں نے آخر کار ملک ہند میں اپنی سلطنت قائم ہی کر لی۔

۱۱۔ بیس برس سلطنت کرنے کے بعد یوسف عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے عادات و اطوار بے نظیر تھے اور کہتے ہیں کہ اپنے زمانے میں مشکل سے کوئی خلاف اخلاق حرکت اس سے سرزد ہوئی ہوں گی۔ اس نے ایک مرہٹن سے شادی کی تھی" جس کا خطاب بوبوجی خانم تھا اور اس کے چار بچے یعنی ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں۔ اس کا بیٹا اسمٰعیل عادل شاہ اس کے بعد تخت پر بیٹھا۔ جو تعلیم، تربیت، علم، دوستی میں اپنے باپ کے ہی برابر تھا" اور ساتھ ساتھ اس میں مذہبی رواداری، انسانیت اور رحم و کرم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یوسف عادل شاہ کا اقبال دیکھو کہ اس کی ایک بیٹی کی شادی فرمانروائے برار سے، اور دوسری کی فرمانروائے احمد نگر سے، اور تیسری کی خود سلطان محمود شاہ کے جھینے

بیٹے سے ہوئی، جو بعد میں چل کر سلطان احمد شاہ بہمنی دوم کے لقب سے بیدر کا بادشاہ بنا۔ اسمٰعیل کے عہد میں بیجاپور کی شہرت کا ڈنکا دور دور بجا یہاں تک کہ ایران کے شاہ اسمٰعیل صفوی نے اپنے سفیروں کو بڑے بڑے تحفہ تحائف دے کر دکن بھیجا، جہاں اسمٰعیل عادل شاہ نے انھیں بڑے کروفر کے ساتھ رکھا، اور دونوں ملکوں میں اس قدر دوستی پیدا ہو گئی کہ ممالک بیجاپور کے جامع مسجدوں میں جمعہ کے خطبے میں بادشاہ کے نام کے ساتھ ساتھ شاہ اسمٰعیل صفوی کا نام بھی لیا جانے لگا۔

۱۲ — یہ سب کچھ تو بیجاپور میں ہو رہا تھا۔ اُدھر احمد نظام الملک بحری اپنا سکہ بہمنی سلطنت کے مغربی حصے میں جما رہا تھا۔ تم اوپر دیکھ چکے ہو کہ اس کا باپ ملک حسن، جو ایک نو مسلم برہمن تھا، محمود گاواں کے انتقال کے بعد چند ماہ تک سلطان محمود شاہ ثانی کا وزیر اعظم رہا تھا، لیکن اس کے قتل کے بعد جب وزارت قاسم برید کو ملی تو اس کا بیٹا ملک احمد نظام الملک جنیر کا طرف دار بن گیا۔ اس نے دیکھا کہ اب بیدر جانے میں میری خیر نہیں، اس لئے اول تو اس نے جنیر کے مقام پر اپنے مخالفوں کو نیچا دکھایا، اور پھر جب قاسم برید نے اس کے خلاف بیدری لشکر بھیجا تو اسے بھی اس نے شکست دی اور خود مختار بن بیٹھا۔ احمد نظام الملک نہایت درجہ متقی اور پرہیزگار تھا اور شاید اس کی اچھی عادتوں ہی کی وجہ سے اسے اتنی بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اُس نے کبھی اپنے آقا نے بہمنی

کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا اور محض نظام الملک کے خطاب پر اکتفا کیا۔ یہ بہت عقلمند اور متین تھا، اور اس کی نظر اتنی وسیع تھی کہ اپنے لشکر کے ایک ایک سپاہی کی غلطی بھی اس سے چھپی نہیں رہی تھی۔ اس نے تلوار کے کرتبوں اور شمشیر بازی کو اپنے ملک میں خوب رواج دیا اور اپنے پائے تخت احمد نگر کو اس شان سے سجایا کہ اس کی نظیر دور دور ملنی دشوار تھی۔ اس کا بیٹا برہان، جس نے سب سے پہلے اپنے نام کے ساتھ نظام شاہ کا لفظ بڑھایا، علماء و فضلاء کا بڑا قدر دان تھا اور جب ایک ایرانی عالم شاہ طاہر ایران سے احمد نگر آیا تو اس نے حکم دیا کہ تمام امراء چار کوس آگے جا کر اس کا استقبال کریں۔

۳۱۔ ان کے علاوہ دو صوبے اور ایسے تھے جن کے حکمرانوں نے اپنے آپ کو ایک حد تک خود مختار کر لیا تھا، ایک تو برار اور دوسرے گولکنڈہ۔ گولکنڈے کی حکومت سلطان قلی خواجہ قطب الملک طہرانی نے قائم کی، لیکن اس شخص کی نیکی دیکھو کہ جب تک محمود شاہ بہمنی زندہ رہا اس وقت تک برابر اسے اپنا آقا اور مربی مانتا رہا، اور جب تک خود زندہ رہا اس وقت تک اس کی رعایا اور دکن کے سب لوگ اسے "بڑا ملک" کے پیارے خطاب سے یاد کرتے تھے۔ آج بھی تم محمد نگر گولکنڈے کے گنبدوں میں جا کر دریافت کرو کہ بڑے ملک کا مزار کہاں ہے تو تمہیں سلطان قلی کے مزار پر لے جا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ اس نے محض اپنے رعب و داب سے دریائے گوداوری تک اپنی حکومت

قائم کر لی تھی اور یہ اس کا اقبال سمجھو کہ اس وقت تک اس کے پائے تخت محمد نگر گولکنڈہ کے محافظ اور اس کے اور اس کے جانشینوں کے مقبرے کی نگرانی خدا کے فضل سے اسی مرد میدان کے اولاد سے ہیں جس نے دو سو برس بعد شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے سپہ سالار کی حیثیت سے بظاہر اس مضبوط قلعے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اسی کی طرح برار کے پہلے فرمانروا فتح اللہ عماد الملک نے بھی اپنی زندگی میں کبھی بادشاہ کا لقب اپنے نام کے ساتھ اضافہ نہیں کیا بلکہ چتر شاہی، سکہ و خطبہ سب سے پہلے اس کے بیٹے علاء الدین عماد شاہ نے استعمال کیا۔

۱۴۔ جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے یہ سب حکمراں کسی نہ کسی طرح سے خواہ برائے نام ہی سہی بیدر کے بہمنی بادشاہ کو اپنا امام سمجھتے تھے اور ان کا طرز عمل کچھ اس قسم کا تھا کہ اپنے میں سے کسی کی قوت بھی حد سے زیادہ بڑھنے دیں، چنانچہ جب ایک ذرا بڑھ جاتا تو باقی سب مل کر اس پر حملہ آور ہوتے اور اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتے۔ رفتہ رفتہ بہمنی بادشاہ کی قوت اس قدر کم ہوگئی کہ وہ قاسم برید یا اس کے بیٹے امیر برید کے ہاتھ میں محض ایک بے جان لاشہ بن گیا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بہمنی بادشاہ بعض مرتبہ بریدیوں کی قید سے رہا ہونا چاہتا ہے اور اپنے کسی ہمسایہ کی پناہ لیتا ہے۔ احمد شاہ دوم اپنے باپ محمود شاہ سے بھی زیادہ بیکار نکلا، اور کہاں تو اس کے زمانے کے دکھنی فرمانرواؤں

میں ایک سے ایک نیک اور قابل تھا، کہاں وہ ہمیشہ عیش و عشرت میں مصروف رہتا اور انتظام سب کا سب امیر برید کے ہاتھ دے کر خود ہر وقت بیکار پڑا رہتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امیر برید کی قوت پہلے سے بھی بڑھ گئی اور اس نے اسے اور اس کے جانشین ولی اللہ دونوں کو ملک عدم بھیج دیا تھا۔ آخری بہمنی بادشاہ کلیم اللہ تھا اور جب اس نے دیکھا کہ دہلی کے نئے بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر کے پاس (جس نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں ہندوستان فتح کیا تھا) اسمٰعیل عادل شاہ، برہان نظام شاہ، سلطان قلی قطب شاہ نے اپنے اپنے سفیر بھیجے ہیں تو اس بے چارے نے خود بھی ایک درخواست لکھی کہ حضور میرے غلاموں اور ملازموں نے میرا ملک دبا لیا ہے اور مجھے قید کر دیا ہے، اگر آپ دکن آئیں تو میں برار اور دولت آباد آپ کی نذر کر دوں گا۔ لیکن جب امیر برید کو اس کی خبر ملی تو وہ اس کے درپے ہو گیا اور بہمنیوں کے اس آخری چراغ کو پہلے بیجاپور اور وہاں سے احمد نگر بھاگنا پڑا۔ بہمنی نام اب بھی ایسا روشن تھا کہ اس بے بس و بے کس بادشاہ کی برہان نظام شاہ نے بہت کچھ تعظیم و توقیر کی لیکن کلیم اللہ بہمنی کی عمر نے وفا نہ کی اور بابر بادشاہ کی فتح پانی پت کے اگلے ہی سال یعنی ۱۵۲۷ء میں اس کے ساتھ بہمنی نام ہمیشہ کے لئے صفحۂ تاریخ سے مٹ گیا۔

باب ۸

آزاد دکھنی سلطنتیں شہنشاہ نورالدین جہانگیر کی وفات تک

(۱۵۲۷ء تا ۱۶۲۸ء)

۱۔ بہمنیوں کا خاتمہ کر دینے کے بعد بھی بریدی حکمرانوں نے کچھ زیادہ رسوخ پیدا نہیں کیا، اور اصل تو یہ ہے کہ یہ خاندان جو اتنے دن تک بیدر کی آزادی قائم رکھ سکا اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ اس کے ہمسایہ سلطنتیں یعنے بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر برابر ایک دوسرے کے ساتھ لڑتی رہتی تھیں۔ امیر برید نے چھیالیس برس حکومت کی اور اس دوران میں ایک دفعہ عادل شاہی فوجوں سے جنگ اور دکیر میں اسے شکست دے کر خاص قلعہ بیدر پر بھی قبضہ کر لیا، اور امیر برید نشے میں کھویا ہوا گرفتار اسمٰعیل عادل شاہ کے حضور میں پیش کیا گیا۔ لیکن اسمٰعیل رحم کا پتلا تھا اور امرا کے سفارشوں اور امیر برید کے منت و سماجت کرنے پر بیدر اور اس کے آس پاس کے گاؤں واپس امیر برید کو دے دئے۔ اس زمانے میں بیدر کے بعض حکمران ایسے کم سمجھ تھے کہ ایک دفعہ ایک بادشاہ نے گیدڑوں کی آواز سن کر

دریافت کیا کہ لوگو یہ کیا کہہ رہے ہیں، تو امرا نے جواب دیا کہ حضور سردی کی شکایت کر رہے ہیں، چنانچہ جہاں پناہ نے سینکڑوں لحاف ان کے اوڑھنے کے لئے بنوائے اور ان میں تقسیم کرنے کے لئے امرار کو دے دئے۔ امیر برید کے بعد اس کا بیٹا علی برید تخت پر بیٹھا جس کا مقبرہ آج بھی اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ لیکن علی کے بعد اس سلطنت میں تنزل کے آثار پیدا ہو گئے، اور آخر کار اس کے مرنے کے پچاس برس کے اندر اندر یعنی ۱۶۰۹ء میں بیدر پر عادل شاہی پھریرا لہرانے لگا۔

۲۔ ادھر برار میں علاء الدین عماد شاہ بعد اس کا بیٹا دریا عماد شاہ تخت پر بیٹھا لیکن اس کے زمانہ میں کوئی خاص بات ایسی نہیں ہوئی جو اس وقت ذکر کرنے کے قابل ہو۔ جب دریا کا انتقال ہوا تو اس کا لڑکا برہان عماد شاہ تخت نشین ہوا۔ برہان نہایت کم عمر بچہ تھا اس لئے قدرتاً حکومت کی باگ اس کے وزیر اعظم تفاول خان کے قبضہ میں آئی۔ حکومت ایسی چیز ہے کہ جب انسان کے پاس آجاتی ہے تو وہ اس پر قبضہ رکھنا چاہتا ہے، چنانچہ تفاول خان نے برہان کو نظر بند کر دیا اور خود گویا مطلق العنان حکمراں کی طرح حکومت کرنے لگا۔ لیکن دغا کا پھل ثیا ہوتا ہے: احمد نگر کے بادشاہ مرتضیٰ نظام شاہ کی عماد شاہی خاندان سے رشتہ داری تھی اور جب اس کے حکم کی تفاول خاں نے پرواہ

نہ کی تو برار پر حملہ آور ہو کر ۱۵۷۲ء میں اس نے پورا اس کا پورا علاقہ اپنی سلطنت احمد نگر میں شامل کر لیا۔

۳۔ الغرض ان دونوں سلطنتوں کو نظر انداز کر کے اب بہمنی سلطنت کی اب تین شاخیں باقی رہتی ہیں جن کی دلچسپ کہانی تمہارے سامنے بیان کرتے ہیں، ایک تو بیجاپور، دوسرے گولکنڈہ اور تیسرے احمد نگر، اور تم دیکھو گے کہ اس زوال کے زمانے میں بھی جب دکن کی حالت گویا آپس کی افراتفری اور باہمی لڑائیوں جھگڑوں اور بری بری عادتوں کی وجہ سے نہایت خراب ہو رہی تھیں اس زمین سے ایسے ایسے باکمال نکلے کہ جن پر ملک ہند جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔ سب سے پہلے تو گولکنڈہ کو لو جس کی آزادی کا حال تم پچھلے باب میں پڑھ چکے ہو۔ تم دیکھ چکے ہو کہ جب تک اس سلطنت کے بانی سلطان قلی قطب الملک کا آقا سلطان محمود شاہ بہمنی زندہ رہا اس وقت تک اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان نہیں کیا۔ یہ بادشاہ نہایت نیک نفس اور اچھا حکمران تھا، اور اس کے طویل عہدِ حکومت میں ملک کو بڑا بھاری فروغ حاصل ہوا۔ جب اس کی عمر ننانوے برس کی ہو گئی تو اس کا نالائق بیٹا جمشید بہت متفکر ہوا کہ میرا بھی بڑھاپا آ گیا ہے لیکن باوا جان اب بھی بادشاہی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ غرض اس بدبخت نے اپنے ایک ساتھی کے ہاتھ سے سلطان قلی کو گولکنڈہ کے جامع مسجد میں عین نماز

پڑھتے ہوئے شہید کر دیا۔ لیکن خدا کا کرنا دیکھو کہ نہ تو جمشید ہی زیادہ حکومت کر سکا اور نہ اس کا بیٹا سبحان قلی ہی زیادہ دن زندہ رہا اور اس پانچ سات برس میں ہی جمشید کی حرکتوں کی وجہ سے اس کی رعایا اتنی ناراض ہو گئی کہ انھوں نے سلطان قلی کے چھوٹے بیٹے ابراہیم قلی کو جو اپنے بھائی جمشید کے نالائق حرکتوں سے ڈر کر وجیانگر بھاگ گیا تھا واپس بلایا اور بڑے تزک و احتشام سے اُسے تخت گولکنڈہ پر بٹھایا۔ ابراہیم گولکنڈہ کے بادشاہوں میں بڑا ممتاز مانا جاتا ہے۔ اس نے اپنے محسن رائے وجیانگر کے دربار میں تلنگی زبان جو سیکھی تھی وہ اسے کبھی نہ بھولا اور اپنے بادشاہ بننے کے بعد بھی برابر اس زبان کو ترقی دیتا رہا۔ اس کے زمانے میں اس نے اپنی پیاری ہندو رعایا کے لئے اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کا دروازہ کھول دیا اور ایک ہندو کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ وہ دل سے سخی تھا اور عالموں کی قدر کرتا تھا۔ یہ ابراہیم قطب شاہ ہی تھا جس کے زمانے میں اس قلعہ گولکنڈہ کی موجودہ حالت قائم ہوئی اور حسین ساگر کی نفیس جھیل جو اب حیدرآباد اور سکندرآباد کے بیچ میں واقع ہے تعمیر ہوئی۔ اس کے زمانہ میں گولکنڈہ کی دولت کی شہرت دور دور پھیل گئی اور سمرقند، عرب اور ایران کے سوداگر یہاں آنے اور تجارت کرنے لگے۔

۳ — اب ذرا احمد نگر کا رُخ کرو۔ یہاں ہم برہان نظام شاہ کو

تخت پر بیٹھا چھوڑ آئے تھے۔ گو اس شخص نے بادشاہ کا لقب اختیار کر لیا تھا لیکن اصل میں یہ بہادر شاہ والی گجرات سے بہت ڈرا ہوا تھا، اور ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ یہ بہادر شاہ کے حملے کی تاب نہ لا سکا اور احمد نگر اسی کے حوالہ کر دیا۔ یہ اسی کا زمانہ تھا، کہ ظہیر الدین بابر بادشاہ نے ۱۵۲۶ء میں پہلی جنگ پانی پت جیت کر دہلی پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد بہار اور راجپوتانے تک کا ملک فتح کر کے تمام شمالی ہندوستان پر اپنا پرچم لہرا دیا۔ بابر کے بعد اس کا بیٹا ہمایوں بادشاہ ہوا اور اس نے گجرات فتح کر کے اپنے ایلچی برہان نظام شاہ کے پاس روانہ کئے جن کی اس نے بڑی آؤ بھگت کی۔ برہان کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا حسین نظام شاہ تخت پر بیٹھا۔

۴ — بیجاپور میں یوسف عادل شاہ نے بڑی بڑی اصلاحات کیں اور فوج میں ہندوؤں کو بھرتی ہونے کی اجازت کے ساتھ ساتھ اپنی مملکت کا دفتر بجائے فارسی کے اردو میں کر دیا۔ اگر غور کرو تو اردو زبان کا گہوارہ دہلی اور لکھنؤ کے بجائے دکن میں پاؤ گے اور آج کل ہمارے اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ نے جو اردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ دراصل اس پرانی سرپرستی کا گویا اعادہ ہے جو آج سے چار پانچ سو برس پہلے دکھنی بادشاہوں نے اس دیسی زبان کی تھی۔ پھر جیسا اوپر بیان کیا گیا ہے اسمٰعیل نے اور دیگر

کی لڑائی میں بیدر کی فوجوں کو شکست دی اور چند روز تک قلعہ بیدر
کی بہمنی تخت گاہ پر بیٹھ کر اس شہر کی پرانی کرّوفر کی یاد تازہ کردی۔
اسمٰعیل کے بعد اس کا بیٹا ملّو عادل شاہ تخت پر بیٹھا لیکن اس نے
چند ہی روز میں اپنی بری عادتوں اور بدکاریوں کی وجہ سے امیر غریب
سب کو ایسا متنفر کر لیا کہ خود اس کی دادی بوبوجی خانم نے اسے تخت
پر سے اتار کر اس کے چھوٹے بھائی ابراہیم عادل کو تخت پر بٹھایا۔
اس بادشاہ نے پہلا کام تو یہ کیا کہ دفتری زبان کو بجائے دیوناگری
کے فارسی حروف میں لکھنا شروع کیا، یعنی کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ
تحریر اس نے آج کل کی سی اردو کو اپنے دفتروں میں رواج دیا۔ ساتھ
ہی اس نے دفتر مالگزاری اور فوج میں نہایت آزادی کے ساتھ
مرہٹوں اور دوسرے ہندوؤں کو بھرتی کیا، اور ان کے ساتھ اتنی رواداری
برتی کہ اپنی سلطنت کا پیشوا یعنی وزیر اعظم بھی ایک برہمن کو مقرر کیا۔
ابراہیم کو دو طرف سے بڑا خطرہ تھا؛ ایک تو اس کا بھائی عبداللہ
پرتگیزوں کے پاس گووا چلا گیا تھا، اور دوسرے اس نے سنا کہ
سلاطین گولکنڈہ اور احمد نگر نے اس کے علاقے پر حملہ کرنے کے
لئے رام راے فرمانروائے بیجانگر سے اتحاد کر لیا ہے۔ لیکن اس نے
دونوں فریقوں کے مخالفت کے باوجود عبداللہ اور پرتگیزوں کو
شکست دی اور اپنی سلطنت کو غیروں سے برابر آزاد رکھا۔ وہ
فنون لطیفہ کا بھی سرپرست تھا اور بیجاپور کی خوبصورت جامع مسجد

کی ابتداء اسی کے زمانے میں رکھی گئی تھی۔ ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا علی عادل شاہ تخت پر بیٹھا۔

۵ — علی عادل شاہ دکن کے عظیم الشان بادشاہوں میں گنے جانے کے قابل ہے، اور اس کے زمانے میں بیجاپور کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ اس کا تدبر ہی تھا کہ باوجود سخت باہمی مخالفتوں کے بہمنی سلطنت کے تمام شاہوں نے اتحاد کر لیا اور اس کے دشمن وجیانگر کی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اس کے عہد میں بیجاپور دنیا کے عالموں فاضلوں کا مرکز بن گیا، اور اس کے خیرات اور داد و دہش سے ایران، توران تک کے عالم فیضیاب ہونے لگے۔ اس کے ساتھ ہی وہ خود اپنے روپیہ نہایت کم خرچ کرتا تھا، سادہ وضع سے رہتا تھا، سادہ کپڑے پہنتا تھا اور پرانے دھرانے قالین پر بیٹھتا تھا۔ وہ خود بھی بڑا بھاری طالب علم تھا اور اسے پڑھنے لکھنے کا آخری عمر تک برابر شوق رہا۔ اس نے اپنے والد کے شروع کی ہوئی جامع مسجد کو پورا کیا اور اپنی پیاری رعایا کے آرام کے لیے بیجاپور میں نہروں اور نلوں کے ذریعے سے سڑک سڑک اور گھر گھر پانی پہنچنے کا انتظام کیا جو صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اسی طرح سے جاری ہے۔ ہندوؤں اور غیر مذہبوں کے ساتھ وہ بہت ہی روادار تھا چنانچہ اس کی فوج میں ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ پائے جاتے تھے۔ جیسے ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں پرتگیز ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر گوا کے علاقے میں

کس قدر مصیبتیں ڈھارہے تھے اور کیسے لوگوں کو تلوار کی نوک پر عیسائی بنا رہے تھے تو ہم ان دکھنی سلطنتوں کی رواداری پر عش عش کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔

۲۔ علی عادل شاہ کے زمانے کا شاید سب سے اہم اور مشہور واقعہ وجیانگر کی شکست اور اس کے علاقہ کا بیجاپور اور اس کے حلیف سلطنتوں میں الحاق تھا۔ یوسف عادل شاہ کے زمانے سے وجیانگر برابر ترقی کر رہا تھا اور کرشن دیو رائے فرمانروائے وجیانگر نے اس سے رائچور اور مدگل لے لئے تھے۔ کرشن دیو رائے کے بعد اس کے شاہی خاندان کو زوال ہوا اور تخت پر ایک غیر شخص رام رائے نے بیٹھ کر وجیانگر کے شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔ چنانچہ یہی وہ فرمانروا تھا جس کے دربار میں ابراہیم نے اپنے باپ سلطان قلی والیٔ گولکنڈہ کے قتل پر پناہ لی تھی اور سات برس برابر اس کے یہاں رہا تھا۔ جب سوئے اتفاق سے رام رائے کے بیٹے کا انتقال ہوا تو علی عادل شاہ نے مناسب سمجھا کہ خود وجیانگر جا کر ماتم پرسی کرے۔ یہاں علی عادل شاہ کی بڑی بھاری آؤ بھگت ہوئی اور رام رائے کے مہارانی نے علی کو گویا اپنا بیٹا بنا لیا۔ لیکن اس سفر کے دوران میں علی عادل کو یہ محسوس ہوا کہ رام رائے نے اس کے ساتھ برابری کا برتاؤ نہیں کیا ہے بلکہ اس کے ساتھ غرور اور تکبر سے پیش آیا ہے۔ اور یہ کیوں نہ ہو؟ دکن کی سلطنتیں ایک دوسرے سے اس قدر لڑتی رہتی تھیں اور ایک دوسرے کی ایسی دشمن تھیں کہ انہیں

اپنے قدیمی دشمن رائے وجیا نگر سے مدد طلب کرنے میں باک نہیں
ہوتا تھا، اور کبھی بیجاپور، کبھی احمد نگر، کبھی گولکنڈہ، کبھی بیدر کے
ایلچی اس کے پاس جاتے رہتے تھے کہ حضور فلاں سلطنت کے
مقابلہ میں ہماری مدد کیجئے۔ آپس کے لڑائی کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ
دونوں لڑنے والے اغیار کی نظروں میں ذلیل ہوجاتے ہیں اور
رام رائے بھی یوسف عادل، ابراہیم قطب اور حسین نظام کو ذلیل
سمجھنے لگا۔ لیکن غرور اور تکبر کا سر نیچا ہوتا ہے اور جب رام رائے
نہ صرف ایلچیوں کے ساتھ بادشاہوں کے ساتھ بھی برا سلوک
کرنے لگا تو ان کے غیرت کو جوش آیا اور باوجود اپنے جھگڑوں ٹنٹوں
کے سب نے سوچا کہ اب ہمیں کسی نہ کسی طرح سے آپس میں اتحاد کر کے
اس کا سر کچلنا چاہیئے۔ قرار پایا کہ حسین نظام شاہ اپنی چہیتی بیٹی چاند بی بی
کو علی عادل شاہ کے ساتھ اور علی عادل شاہ اپنی بہن ہدیہ سلطانہ
کا حسین کے بیٹے شہزادہ مرتضیٰ کے ساتھ نکاح کر دیں اور ساتھ ہی
علی برید شاہ بیدر اور ابراہیم قطب شاہ کو بھی اس اتحاد میں شریک
ہونے کی دعوت دی جائے۔ الغرض یہ دونوں شادیاں نہایت درجہ
دھوم دھام سے ہوئیں اور ایک دلہن احمد نگر اور دوسری بیجاپور
آگئی۔ اس پر علی عادل نے رام رائے سے کہلوایا کہ حضرت میرے
والد کے زمانے میں جو قلعے آپ کے پیشرو نے لئے تھے وہ مہربانی
کر کے واپس کر دیجئے۔ رام رائے کیا جانتا تھا کہ اتفاق اور اتحاد سے

کس قدر قوت حاصل ہوتی ہے؛ وہ تو یہی سمجھا تھا کہ یہ سب اتفاق چندروزہ ہے۔ آخر کار متحدہ فوجیں تالی کوٹہ کے مقام پر اس کے لشکر پر آپڑیں اور اس کا بالکل خاتمہ کرکے رام راجے کا سر کاٹا اور وجیانگر کو اینٹ سے اینٹ بجا کر اس کا علاقہ آپس میں تقسیم کر دیا۔

۷۔ جنگ تالی کوٹہ کے بعد ہی حسین نظام شاہ فرمانروائے احمد نگر کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا برہان نظام شاہ تخت پر بیٹھا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی میں اس نے برار کا ملک فتح کر لیا اور وہاں کے شاہی خاندان کا خاتمہ کرکے اس کا اپنی سلطنت میں الحاق کر لیا۔ اس نے اپنے بیٹے میراں حسین کا نکاح ابراہیم عادل شاہ کی بہن خدیجہ سلطانہ کے ساتھ کیا۔ شادی بہت دھوم دھام سے رچائی گئی اور دلہن کے ڈولے کے ساتھ مدت بعد مرتضیٰ کی بہن چاند بی بی اپنے بھائی سے ملنے کے لئے احمد نگر آئی۔ اس زمانے میں بابر بادشاہ کا پوتا یعنی ہمایوں کا بیٹا اور ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں میں سب سے بڑا اور ممتاز شہنشاہ اکبر دہلی کے تخت پر بیٹھا تھا اور اپنی دوراندیشی اور تدبر سے اس نے اپنی پیاری رعایا کو خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سب کو اپنا بنا لیا تھا۔ کچھ تو گرو نانک کے اصول سے کہ خدا ایک ہے ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے اور ہندو مسلمان سب اس ایک خدا کے بندے ہیں، اور کچھ اس زمانے کے مسلمان بادشاہوں کی تدبیروں سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑی یگانگت

پیدا ہو گئی تھی، چنانچہ جیسا تم پڑھ چکے ہو، دکھنی بادشاہ ادھر دکن میں ہندوؤں کو اپنی فوجوں میں بھرتی کر رہے تھے، اور اُدھر شمالی ہند میں ہندو راجوں مہاراجوں سے رشتے پیدا کر کے اور انھیں بڑے بڑے عہدے دے کر اکبر اعظم نے ان کا دل موہ لیا تھا۔ الغرض اس کی قوت اتنی بڑھی کہ اس نے مالوہ اور خاندیش اور سورت تک تمام ملک فتح کر لیا۔ مرتضیٰ کے تخت پر بیٹھنے پر اس کا بھائی برہان اکبر کے دربار میں بھاگ گیا تھا اور جب اس نے دکن کے حالات بیان کئے ہوں گے اور یہاں کے اندرونی لڑائیوں جھگڑوں کا ذکر کیا ہوگا تو اکبر کے منہ میں پانی بھر آیا ہوگا۔ بدقسمتی سے عین اس موقعہ پر مرتضیٰ نظام شاہ کے دماغ میں کچھ خلل سا ہوا اور وہ خود اپنے بیٹے کے قتل کے درپے ہو گیا لیکن اس کشمکش میں بجائے اس کے کہ وہ اپنے بیٹے کا کام تمام کرے خود ہی لقمۂ اجل ہو گیا۔

۸۔ میران حسین جو اپنے والد مرتضیٰ حسین کے بعد تخت احمد نگر پر بیٹھا نہایت ظالم اور سفاک تھا جس کی وجہ سے بہت جلد اس کے امرا نے اسے پکڑ کر مار ڈالا اور ایک مجلس منعقد کر کے یہ قرار دیا کہ اب اس برہان کا جو اکبر کے پاس بھاگ گیا تھا، بیٹا تخت پر بٹھایا جائے الغرض امرا گئے اور قلعہ سے اس لڑکے کو جس کا نام اسمٰعیل تھا نکال کر اسمٰعیل نظام شاہ کے لقب سے اسے تخت نشین کر دیا۔ لیکن برہان کو یہ کب اچھا معلوم ہوتا تھا کہ بیٹا تو بادشاہ ہو اور خود غیر کے در پر مفت کی

روٹیاں کھائے، چنانچہ آپس کے جھگڑوں کی یہ سب خبریں سُن کر وہ واپس آیا اور بیٹے کی جگہ خود تخت پر بیٹھ گیا۔ یہ بادشاہ جانتا تھا کہ لڑائی جھگڑوں کا پھل کڑوا ہوتا ہے اور لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے سلطنت کو کیا؟ خاندان تک کو دوسروں کی نظر میں حقیر ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اس نے اپنی چار برس کی حکومت امن وامان سے بسر کی اور احمد نگر کی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ برھان کے انتقال پر اس کا چھوٹا بیٹا ابراہیم تخت پر بیٹھا لیکن یہ چند مہینے ہی سلطنت کر چکا تھا کہ ایک لڑائی میں اس کے ایک تیر لگا جس کے صدمے سے اس کا کام تمام ہو گیا۔

۹ - ابراہیم کے انتقال پر احمد نگر میں بڑی افراتفری پھیلی، جو ہمیشہ زوال کی نشانی ہوتی ہے، اور چونکہ ابراہیم کے بیٹے بہادر کی عمر صرف ڈیڑھ برس کی تھی اس لئے طرح طرح کے سچے جھوٹے دعویدار پیدا ہو گئے۔ اُمرا کو تو اس کی پرواہ بھی نہیں کہ اتفاق ہی سے طاقت پیدا ہوتی ہے، ان میں سے بعض نے تو بہادر کے بادشاہی کا اعلان کیا، بعض نے ایک شخص مسمی احمد کے سر پر چتر شاہی لگایا جس کے باپ کے متعلق عام طور پر یہ یقین تھا کہ وہ شاہی خاندان کا فرد نہیں ہے، بعض نے کسی راستہ چلتے کو پکڑ لیا اور اسے بادشاہ کہنے لگے، اور بعض نے تو یہ تک کیا کہ شاہزادہ مراد پسر اکبر اعظم کو جو اس زمانہ میں دہلی کی طرف سے مالوہ کا صوبہ دار تھا، احمد نگر آنے کی دعوت

دے دی۔ دہلی والے تو ایسے موقع کی تاک میں بیٹھے ہی تھے، فوراً شاہزادہ مراد نے اپنے مغلوں اور راجپوتوں کی فوج لاکر احمد نگر کے فصیل کے سامنے آکر پڑاؤ ڈال دیا، اور چونکہ گھر ہی میں پھوٹ پڑی ہوئی تھی اس لئے اس شمالی فوج کا کسی نے بھی سامنا نہیں کیا۔ مگر جو کام نامراد اور بدبخت گھر پھونک تماشا دیکھنے والے مردوں سے نہ ہوا تھا وہ ایک عورت نے کر دکھایا۔ اس دوران میں جب نظام شاہیوں نے دیکھا کہ اب بغیر آپس میں اتفاق و اتحاد کے ہم کچھ نہیں کر سکیں گے تو آخر کار انہوں نے متحد ہو کر بہادر کو ہی تخت پر بٹھایا اور اس کی بوڑھی دادی چاند بی بی کو اس کا اتالیق بنایا۔ چاند بی بی نے اپنی بہادری اور احمد نگر کی آزادی کے خاطر اپنی جانبازی کے ایسے جوہر دکھائے کہ ہمارا ملک جتنا بھی اس پر فخر کرے بجا ہے۔ یہ خود زرہ پہن، منہ پر نقاب ڈال، تلوار ہاتھ میں لے، عین میدان کارزار میں لڑنے کو کھڑی ہو گئی اور چار گھنٹے برابر گھمسان لڑائی میں ایسی لڑی، ایسی لڑی کہ آخر کار مغل فوج کو واپس ہٹ جانا پڑا، اور شہزادہ مراد نے خود چاند سلطانہ سے صلح امن کی درخواست کی۔ خدا کی قدرت کہ تمام ہندوستان کے لشکر کا مقابلہ ایک بوڑھی عورت کرتی ہے، اور آخر اسے صرف برار کا ملک دے کر واپس جانے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن پھوٹ کا ستیاناس ہو، لوگوں کو اس بہادر ملکہ سے حسد ہو گیا، اور ایک فریق ایسا پھر پیدا ہوا جو اپنے اپنے امیدوار پیش کرنا چاہتا تھا اور جس نے دوبارہ مغلوں کو

طلب کرلیا۔ مراد کا تو انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اب اکبر کا مشہور درباری ابوالفضل دکن کا صوبہ دار تھا۔ اس نے ایک عظیم الشان فوج ساتھ لے کر پہلے گوداوری کے کنارے گولکنڈہ، بیجاپور اور احمد نگر کی متفقہ فوج کو شکست دی اور اس کے بعد سیدھا احمد نگر آیا جہاں چاند بی بی نے دیکھ کر کہ آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے مقابلے کا تاب مشکل ہے اپنی جان دے دی۔ اس کے بعد خاص شہر احمد نگر پر مغلوں کا پھریرا لہرانے لگا۔

۱۰۔ اب بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک ہی ہلّے میں تمام دکن پر مغل قبضہ کرلیں گے۔ یہ دکن کی خوش نصیبی تھی کہ اسے ایک ایسا شخص مل گیا جو برابر تیس برس تک مغلوں کو صرف اپنے بل بوتے پر روکے رہا۔ یہ شخص محض ایک آفاقی، محض ایک حبشی، جو کسی زمانہ میں تین دفعہ بک چکا تھا، ملک عنبر تھا۔ جس وقت احمد نگر فتح ہوا ہے اس وقت یہ شخص اپنی قابلیت کی وجہ سے ترقی کرتے کرتے دولت آباد کا صوبہ دار بن گیا تھا۔ احمد نگر کے نکل جانے کے بعد اُمراء نے اپنے لڑائی جھگڑوں سے توبہ کرکے برہان نظام شاہ اول کے بیٹے مرتضیٰ کو مرتضیٰ نظام شاہ دوم کے خطاب سے نظام شاہی سلطنت کے قدیم پائے تخت جنیر میں تخت پر بٹھادیا تھا۔ رفتہ رفتہ جب ملک عنبر اپنی ترکیبوں اور اپنی قابلیت کی وجہ سے سلطنت کا وکیل مطلق یعنی وزیراعظم بن گیا تو وہ اس مرتضیٰ کو جنیر سے اپنے مستقر دولت آباد کے

قریب کھڑکی (جو اب اورنگ آباد کے نام سے مشہور ہے) لے آیا اور اس وقت سے اپنی موت تک نہ صرف نظام شاہی سلطنت کا بلکہ کل دکن کا مختار کل بن گیا۔ اس نے بیجاپور اور گولکنڈہ والوں سے کہا کہ آج مغل میرے یہاں ہیں تو کل تمہارے یہاں ہوں گے اس لئے مناسب ہے کہ تم روپیہ کے ذریعے میری مدد کرو اور اس طرح اپنی مہمات کے لئے وہاں دونوں سلطنتوں سے برابر روپیہ وصول کرتا رہا۔ پھر ملک عنبر نے دیکھا کہ مرہٹہ قوم میں مرنے مارنے کی بڑی قابلیت ہے اس لئے اس نے ان میں سے لشکر کے لشکر بھرتی کئے، جس کی وجہ سے اس قوم میں نئی جان پڑگئی اور اسے باضابطہ لڑنا آگیا۔ ادھر اکبر اعظم کے بعد اس کا بیٹا نورالدین محمد جہانگیر شہنشاہ ہند ہوا اور اس نے اپنے بیٹے شہزادہ پرویز کو دکن بھیجا۔ لیکن ملک عنبر نے دکن کی قوت اتنی بڑھا دی تھی کہ اس نے پرویز کو کچھ تو میدان جنگ میں اور کچھ قزاقانہ طریق سے شکست دے دی اور دس برس کے بعد از سرِ نو شہر احمد نگر پر قبضہ کرکے شہزادہ خرم کے آنے تک برابر مغلوں کے صوبوں کو تاراج کرتا رہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں خرم کے حملے کی تاب نہیں لاسکتا تو اس نے آخرکار مغلوں سے صلح کرلی۔ لیکن خرم (جسے اب اس کے باپ نے شاہ جہاں کا خطاب دے دیا تھا) کسی بات پر باپ سے ناراض ہوگیا اور اس کے خلاف بغاوت کر بیٹھا۔ اب کیا تھا عنبر کو پھر موقع ہاتھ آیا اور محمد قطب شاہ اور ابراہیم عادل شاہ

سے جبراً خراج وصول کرے احمد نگر کے تقریباً تمام پہلے علاقے پر قبضہ
کرلیا۔ الغرض جب وہ اسّی برس کی عمر میں مرا ہے تو وہ اپنے آقا
مرتضیٰ نظام شاہ کی طرف سے احمد نگر کے تقریباً تمام قدیم علاقے پر قابض
تھا۔

۱۱۔ صرف میدان جنگ ہی میں نہیں بلکہ سلطنت کے کاروبار
میں بھی ملک عنبر کا نام بہت مشہور ہے اور اگر اس کا کوئی دشمن ہو تو
اسے بھی اس کی تعریف کرنی پڑی ہے۔ اس نے اپنی سلطنت کی
مکمل پیمائش کرائی جو پچھلی صدی عیسوی کے وسط تک یعنی انگریزوں
کے آنے کے بعد تک صحیح تسلیم کی گئی۔ پھر اس نے دیہات کا ٹھیکے
پر دیا جانا بند کرایا اور کسانوں کو خود اپنے کھیتوں کا مالک قرار دے کر
آمدنی کا تیسرا حصہ حکومت کی مالگزاری قرار دیا۔ اس کے زمانے میں
ملک میں بالکل امن وامان تھا۔ ملک بہت سے سرکاروں یا اضلاع
میں اور ہر ضلع بہت سے "تعلقوں" یا "دیشوں" میں منقسم تھا۔
زمین کے متعلق جو معمولی مقدمات ہوتے تھے وہ گاؤں کے پنچایتوں
میں ہی طے ہوجاتے تھے اور رعایا کو عدالت میں جانے کی ضرورت
نہیں پڑتی تھی۔ بہرحال ملک عنبر جب تک زندہ رہا اس وقت تک
تو انتظام قائم رہا لیکن اس کے مرنے کے بعد سب کچھ تہ وبالا ہوگیا
اور شہنشاہ جہانگیر کے انتقال سے پہلے ہی یہ نظر آنے لگا کہ اب
احمد نگر کی سلطنت میں بالکل سکت باقی نہیں ہے اور ایک زمیں

یہ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔

۱۲ — ہم نے بیجاپور کی کہانی علی عادل شاہ تک تو سن لی علی کے بعد اس کا بھتیجا ابراہیم تخت پر بیٹھا۔ ابراہیم کے لڑکپن ہی سے اس کی چچی چاند بی بی اور پھر دوسرے امرا نے سلطنت کا کام کیا۔ لیکن جب ابراہیم جوان ہوا تو حکومت کا کاروبار خود اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے زمانے میں بیجاپور کی سلطنت ساحل ملیبار اور میسور کے جنوب تک پہنچ گئی اور تقریباً تمام جنوبی راجے مہاراجے اس کے خراج گزار بن گئے لیکن اس کے برعکس بیجاپور آپس کے لڑائی جھگڑوں سے اتنا کمزور ہو رہا تھا کہ جب اکبر اعظم کا ایلچی بیجاپور آیا تو ابراہیم کو اسے پیش کش دینی پڑی، اور اسی طرح جب جہانگیر نے اپنے بیٹے شہزادہ خرم کو دکن کے مہمات پر مامور کیا تو ابراہیم عادل شاہ کو شہنشاہی فرمان کو چوم کر اپنے سر پر رکھنا پڑا۔ اُدھر ابراہیم کو ملک عنبر سے خوف لگا ہوا تھا اور ایک دفعہ تو ملک عنبر نے خراج وصول کرنے کی غرض سے سلطنت عادل شاہی میں گھس کر خاص بیجاپور کو تاراج کر دیا۔ باوجود ان تمام مصیبتوں کے ابراہیم عادل شاہ ہر طرح کے فنون لطیفہ کا دل سے قدردان تھا، اور خود بھی موسیقی، خوش نویسی، مصوری اور فن تعمیر کا ماہر تھا۔ چنانچہ آج بھی اس کا مقبرہ بیجاپور کی اعلیٰ درجہ کی عمارتوں میں گنا جاتا ہے۔ مغل شہنشاہ کی طرف سے جو سفیر بیجاپور آیا تھا اس نے اس شہر کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دئے ہیں اور شہر کے

اعلیٰ درجے کی ترتیب صفائی اور دولت کا ذکر کرتے ہوئے اس کا منہ سوکھتا ہے ابراہیم عادل شاہ کا انتقال ملک عنبر کی وفات سے دو سال بعد اسی سال ہوا جس سال شہنشاہ نورالدین جہانگیر نے لاہور میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا۔

۱۳۔ اب آخر میں صرف گولکنڈہ کے بادشاہوں کا ذکر باقی ہے ابراہیم قلی کے بعد محمد قلی گولکنڈہ کے تخت پر بیٹھا۔ اسی کے زمانے میں احمد نگر پر تباہی آئی اور غیروں کا قبضہ ہونے پر یہاں کی غیرت مند آبادی گھر کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرنے لگی، یہاں تک کہ ان میں سے بہت سوں نے گولکنڈہ آکر پناہ لی، جس کی وجہ سے اس شہر کی آبادی اتنی بڑھی کہ حکومت کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ ایک روز یہاں کا بادشاہ شکار کے لئے جا رہا تھا کہ اسے موسی ندی کے کنارے ایک سبزہ زار پسند آیا اور اس نے حکم دیا کہ وہیں ایک شہر آباد کیا جائے اور اپنی ایک بیوی بھاگ متی کے نام پر اس کا نام بھاگ نگر رکھ دیا۔ یہی وہ شہر تھا جس کا نام اٹھارہ برس بعد بدل کر حیدرآباد رکھ دیا گیا۔ اور جو آج فضلِ الٰہی سے ہماری سلطنت کا صدر مقام ہے۔ جتنی بڑی بڑی پرانی عمارتیں تم آج حیدرآباد میں دیکھو گے ان میں سے اکثر اسی محمد قلی کی بنوائی ہوئی ہیں جیسے چار مینار، چار کمان، پرانا پل، جامع مسجد اور دارالشفاء لیکن افسوس ہے کہ اس کے بنائے ہوئے محلات جو ندی کے کنارے پر تھے زمانے کے گزرنے پر باقی نہیں رہے بلکہ ان کا نشان تک جاتا رہا

اس کے عہد میں بھاگ نگر نے بڑی ترقی کی اور کہتے ہیں کہ اس کے حماموں، خانقاہوں، مدرسوں، مسجدوں اور لنگروں کی تعداد اسی کے عہد میں بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ محمد قلی کے بعد اس کا بیٹا محمد قطب شاہ گولکنڈہ یا حیدر آباد کے تخت پر بیٹھا اور اس نے مکہ مسجد کی بنیاد رکھی۔ یوں تو محمد قلی ہی کو اکبر کے ایلچیوں کے سامنے پیشکش گزارنی پڑی تھی لیکن افسری اور ماتحتی کا رشتہ جو اس طرح شہنشاہ ہند اور گولکنڈہ کے درمیان قائم تھا اس کی محمد قطب شاہ کے زمانے میں اور بھی زیادہ تقویت پہنچی، چنانچہ جب شہزادہ خرم کے ایلچی حیدر آباد آئے تو ان کا بہت دھوم دھام سے استقبال کیا گیا اور ان کے ذریعہ سے ہی محمد قطب شاہ نے دہلی خراج روانہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ محمد قطب شاہ کے بیٹے عبداللہ کے تخت نشینی پر (جو تقریباً اسی زمانے میں ہوئی جب دہلی کے تخت پر جہانگیر کی جگہ شہاب الدین محمد شاہجہاں بیٹھا ہے) جو دو دکھنی سلطنتیں باقی رہی تھیں (یعنے بیجاپور اور گولکنڈہ) وہ نہایت ہی کمزور ہو گئی تھیں۔

باب ۹

دکن

عہد شاہجہانی اور عہد عالمگیری میں

(۱۶۲۸ء تا ۱۷۰۷ء)

۱۔ تم پچھلے باب میں یہ پڑھ آئے ہو کہ ملک عنبر نے کس طرح زندگی میں نہ صرف نظام شاہی سلطنت کو بلکہ تمام دکن کو شمالی ہندوستان سے آزاد رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ باوجود طرح طرح کے خانہ جنگیوں اور باہمی فسادوں کے دکھنیوں نے اپنی آزادی کی خاطر اس زمانے میں ایسے ایسے کام کئے کہ جن کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ ملک عنبر کے مرنے پر نظام شاہی تخت پر برہان سوم متمکن تھا۔ لیکن علاوہ دولت آباد اور کھڑکی کے باقی تمام نظام شاہی علاقے پر مغل قابض تھے۔ پہلے تو برہان نے چاہا کہ کسی نہ کسی طرح ملک عنبر کے بیٹے فتح خان سے اپنے آپ کو آزاد کرے لیکن فتح خان نے اپنی چالاکی سے بادشاہ کے ایک نہ چلنے دی اور اسے دولت آباد کے قلعہ سے نکلنے نہیں دیا۔ اگر فتح خان میں اپنے باپ سی قابلیت اور آزادی وطن کا درد ہوتا

تو وہ اب بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن اس بدبخت نے شاہجہاں بادشاہ سے (جو اپنے باپ کے مرنے پر ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا تھا) سازش کر لی اور اپنے آقا کو قتل کر کے شاہجہاں کے ایماء سے اس کے بیٹے حسین کو تخت پر بٹھایا۔ غالباً فتح خاں کی اس حرکت کی وجہ سے تمام دکن میں جوش پھیل گیا اور ہندو مسلمان دکھنی مرہٹے اور آفاقی سب ہی تو نظام شاہی راج کے لیے اپنی جان و مال قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ شاہ جہاں نے اب مہابت خاں کو دولت آباد کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ لیکن اس دوران میں خود فتح خاں اپنے کئے ہوئے پر نادم ہو گیا تھا اور اس نے مغل فوجوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ گو دکھنیوں کے پاس توپ بندوق کی کمی نہ تھی، لیکن ان کی فوج میں تادیب و تنظیم بہت کم تھی، چنانچہ جب مغلوں کی ترتیب یافتہ فوج نے دولت آباد کا محاصرہ کیا تو دکھنی اس کی تاب نہ لا سکے اور آخر کار قلعہ کو مغلوں کے حوالے کر دینا پڑا۔ اس زمانے کے انتظامات کی حالت دیکھو کہ گو نہ تار تھا نہ ریل محض سڑکیں اور گھوڑا گاڑیاں تھیں، لیکن کہتے ہیں کہ دولت آباد کے فتح ہونے کی خبر وہاں سے ایک ہزار میل کے قریب آگرہ ایک ہفتے کے اندر اندر پہنچ گئی تھی۔ شاہ جہاں نے حکم دیا کہ حسین کو گوالیار میں قید کر لیا جائے اور اس کے تمام ملک پر قبضہ کر لیا جائے۔

۴۔ لیکن جس سلطنت کے لئے چاند سلطانہ نے اپنی جان دی

تھی اور ملک عنبر نے اپنی زندگی گویا وقف کر دی تھی اس کا ایسی آسانی سے خاتمہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اب مشکل سے پرانی نظام شاہی سلطنت کا کوئی حصہ آزاد رہا ہوگا لیکن احمد نگر کے ایک امیر شاہ جی بھونسلہ نے دولت آباد کے تسخیر کے بعد ہی نظام شاہی خاندان کے ایک فرد مرتضیٰ کو کہیں سے نکال کر شاہ گڑھ کے مقام پر تخت نشین کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے بہت جلد دھوکہ دے کر قلعہ جنیر پر بھی قبضہ کر کے مرتضیٰ کو وہاں لے جا کر بٹھا دیا اور خود پیشوائے سلطنت بن کر یکے بعد دیگرے کوکن کے قلعوں پر قبضہ کرتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ اپنے آقا کے نام سے بالا گھاٹ تک کے تمام علاقے پر آزادانہ حکومت کرنے لگا۔ یہ شاہ جی دراصل کھڑکی (اورنگ آباد) کے قریب کا رہنے والا تھا اور اس کے باپ مالوجی کو نظام شاہی حکومت کی طرف سے راجہ کا خطاب اور جنیر کے قلعہ شیونری کی قلعہ داری ملی تھی۔ کہتے ہیں کہ مالوجی کے اولاد نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے وہ ایک مسلمان بزرگ شاہ شریف کے پاس دعا کرانے کے لیے گیا۔ جب شاہ صاحب کے دعا سے خداتعالی نے مالوجی کو دو بیٹے عطا فرمائے تو اس نے ان کے نام پر ایک کا نام شریف جی رکھا اور دوسرے کا شاہ جی۔ یہ شاہ جی وہی تھا جس کا بیٹا سیواجی مرہٹہ قوم کا سب سے بڑا فرد مانا جاتا ہے اور جس نے آگے چل کر اپنے داؤں پیچوں اور اپنی ترکیبوں سے اپنے دشمنوں کو تنگ کر کے چھوڑا۔ بہرحال شاہ جی زیادہ دن تک اپنے ملک اور

آقا کی آزادی برقرار نہیں رکھ سکا اور جب جنیرد ہلی والوں کے قبضے میں آگیا تو اس نے خاندان احمد نگر کے آخری چراغ مرتضیٰ کو تو اورنگ زیب کے قائم مقام خان زماں خان کے حوالہ کیا اور خود محمد عادل شاہ کے دربار میں ملازمت اختیار کرلی - یہ واقعہ ۱۶۳۵ء کا ہے -

۳ - بیجاپور پہنچ کر شاہ جی نے اس سلطنت کی دل کھول کر خدمت کی اور باوجودیکہ مغلوں کے دباؤ کی وجہ سے دکھنی سلطنتوں میں وہ پہلے کی سی قوت باقی نہیں رہی تھی لیکن اس نے محمد عادل شاہ کے لئے تقریباً تمام جنوبی ہندوستان میسور اور جنجی تک فتح کرلیا - لیکن نظام شاہی سلطنت کی فتح بعد بیجاپور اور گولکنڈہ کی حیثیت محض باجگذار ریاستوں کی ہوگئی تھی اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ شاہجہاں ایک ایک مستقل ایلچی (جس کی نوعیت آج کل کے رزیڈنٹ کی سی ہوتی تھی) دونوں جگہ مقرر کرتا ہے اور جب مقرر شدہ ایلچی ان مقامات کا رخ کرتا ہے تو عادل شاہ ہو یا قطب شاہ وہ کئی کئی میل اس کی ملاقات کو جاتا ہے - پھر جس طرح کسی زمانے میں وجیانگر کا رائے بہمنی بادشاہوں کو خراج دیتا تھا بالکل اسی طرح سے عادل شاہ اور قطب شاہ کو مقررہ خراج دینا پڑتا تھا اور نہیں دیتے تھے تو ان پر فوج کشی ہوتی تھی - اب مغلوں نے دکن کا اتنا حصہ فتح کرلیا تھا کہ انہیں اس کے چار صوبے

بنانے پڑے تھے۔ (۱) دکن خاص مستقر دولت آباد (۲) تلنگانہ مستقر ناندیڑ (۳) خاندیش مستقر اسیر گڈھ (۴) برار مستقر ایلچ پور۔ عام طور پر دکن کا صوبہ دار کوئی شاہزادہ ہوتا تھا، جیسے شاہ شجاع اور اورنگ زیب، ورنہ کوئی بڑا سپہ سالار جیسے مہوا راجہ جے سنگھ اور خان جہاں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ معاملات کی اہمیت کو دیکھ کر خود بادشاہ بھی دکن آجاتا تھا، اور اورنگ زیب سے تو مرہٹوں اور دکھنی سلطنتوں کو زیر کرنے کے لئے دکن آکر تقریباً پچیس برس کے لئے کھڑکی کو اپنا پائے تخت بنا دیا اور اس کا نام بدل کر اورنگ آباد رکھ دیا۔ یہ مغلوں کی سلطنت عجیب و غریب تھی۔ اگر تم ان افسروں کے نام پڑھو جو شاہی لشکروں کے کمان میں دکن آئے تھے تو ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں ہندو، مسلمان، مغل، پٹھان، راجپوت، ترکمان، دکھنی، ہندی، سندھی سب ہوتے تھے اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مغل بادشاہ اپنی رعایا کو کس طرح بالکل مساوی درجہ دیتے تھے اور کیسے ان کے زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں رشتے ناتے اور تعلقات قائم تھے۔ ہم پڑھتے ہیں کہ جب وسطی ایشیاء میں بلخ فتح کرنے کی ضرورت ہوئی تو ایک شاہزادے کے ساتھ ایک اعلیٰ درجے کے ہندو سپہ سالار کو بھیجا گیا، اور یہ تو روز مرہ کی بات تھی کہ کابل میں، بنگالہ میں اور دکن میں ہندو راجپوتوں کو صوبہ دار اور سپہ سالار اعلیٰ مقرر کیا جائے۔

۴۔ لیکن باوجود اس قوت اور اس لاؤ لشکر کے دکن کو پوری طور سے فتح کرنے میں مغلوں کو بڑی بڑی مشکلات اٹھانی پڑیں، اور بیجا پور و گولکنڈہ پر قبضہ کرنا ان کے لئے تقریباً اتنا ہی دشوار ثابت ہوا جیسے سلطنت احمد نگر پر قبضہ کرنا۔ دکھنی اپنے عزیز ملک کی باقی ماندہ آزادی کے خاطر چپہ چپہ بھر زمین کے لیئے لڑے پھر اس زمانے میں ایک نیا دشمن یعنی مرہٹے پیدا ہو گئے جنھوں نے پہلے تو نظام شاہیوں اور عادل شاہیوں کا ساتھ دیا اور جب انھوں نے دیکھا کہ نظام شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور عادل شاہیوں کی جڑ کھوکھلی ہو گئی ہے تو انھوں نے خود ایک ریاست الگ قائم کر کے مغلوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا اور اتنے حملے کئے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد دہلی سے بنگالہ اور میسور تک مغلوں کے تمام صوبوں میں بے چینی پیدا کر دی۔ تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ اس قوم نے ملک عنبر کے دربار میں پہلے پہل تنظیم و ترتیب کے سبق حاصل کیئے تھے اور اب شاہ جی کے ماتحتی میں انھوں نے بیجا پور کے لئے تمام جنوبی ہندوستان زیر کر لیا۔ شاہ جی کا بیٹا شیواجی شیونری کے قلعہ میں پیدا ہوا اور اس نے کچھ اپنی ہمت اور جرأت سے اور کچھ اپنے داؤں پیچ سے متعدد عادل شاہی قلعوں کو لے لیا، یہاں تک کہ محمد عادل شاہ کے کہنے سے شاہ جی اپنے حوصلہ مند بیٹے کو روک نہ سکا اور بادشاہ نے اسے نظر بند کر دیا۔ لیکن شیواجی برابر اپنے دیس یعنی پونا اور اس کے

گرد و نواح کے قلعہ پر قلعہ لیتا جاتا تھا۔ بات یہ تھی کہ عادل شاہی سلطنت کو ایک طرف تو مغلوں کو روکنا پڑتا تھا دوسری جانب اپنی جنوبی حصوں کی حفاظت کرنی پڑتی تھی، جس کی وجہ سے وہ ان پہاڑی قلعوں سے جو قدرتی طور پر محفوظ تھے ذرا بے پرواہ تھے۔ بہر حال شیواجی نے چاروں طرف بیجاپور کے گاؤں کو لوٹ کر اور وہاں کے بیچارے باشندوں سے روپیہ وصول کر کے اپنی قوت اتنی بڑھائی کہ محمد عادل کے بیٹے علی عادل شاہ دوم نے اس کے خلاف ایک بڑا لشکر افضل خاں کے ماتحتی میں بھیجا لیکن شیواجی نے دھوکا دے کر افضل خاں کو بھی قتل کر دیا۔

۵۔ شیواجی کو اب بیجاپور کے عیش و عشرت میں پڑے ہوئے امیروں کا تو ڈر باقی نہیں رہا تھا اس لئے وہ اب مغلوں کے علاقے کی طرف پلٹا۔ دہلی کے تخت پر چند سال تو شاہ جہاں رہا لیکن اس کے بیٹے اورنگ زیب نے جب یہ دیکھا کہ بادشاہ اس کے بھائی داراشکوہ کو ولیعہد بنانا چاہتا ہے تو رفتہ رفتہ اپنے سب بھائیوں کو اپنے قابو میں لاکر اور بادشاہ کو آگرے میں نظر بند کر کے خود تخت نشین ہوگیا، اور جب آٹھ برس بعد شاہ جہاں کا انتقال ہوا تو اسے اپنی ماں کے "مقبرے" میں دفن کر دیا، جس کا نام "مقبرۂ ممتاز محل" سے بگڑ کر اب "تاج محل" کے نام سے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ جب شمالی ہندوستان میں یہ خانہ جنگی ہو رہی تھی تو شیواجی نے موقع پا کر

مغل علاقے پر خوب چھاپے مارے، بندر سورت پر حملہ کر دیا اور شہنشاہ ہند کے خود ماموں نواب شائستہ خاں کو پونا سے بھگا دیا۔ یہ سب اسی وقت تھا جب تک سلطنت مغلیہ میں بھائیوں بھائیوں کی لڑائی کی وجہ سے پھوٹ پڑی ہوئی تھی، چنانچہ جب عالمگیر کو چین ملا تو اس نے اپنے چہیتے سپہ سالار مرزا راجہ جے سنگھ کو شیواجی کے خلاف بھیجا، اور آخر کار اسے بادشاہ کی اطاعت قبول کرنی پڑی۔ لیکن جس شخص کو بغاوتوں اور لوٹ مار کا چسکہ لگ جائے اُسے چین کب ملتا ہے چنانچہ وہ اپنی موت تک برابر مغلوں کو دق کرتا رہا اور اس نے بڑی دھوم دھام سے ۱۶۷۴ء میں سنگھ گڑھ میں اپنی تاجپوشی منا کر مہاراجہ شیواجی کا خطاب اختیار کیا۔

۶ ۔ ادھر بیجاپور میں علی عادل شاہ کے بعد اس کا بیٹا سکندر عادل شاہ تخت پر بیٹھا۔ بظاہر اس کے عہد کے ابتدا میں عادل شاہی سلطنت اپنے عروج پر تھی۔ روپیہ کی اس قدر افراط تھی کہ بازاروں میں ہُن ہی ہُن نظر آتے تھے اور چاندی سے زیادہ سونے کا رواج تھا۔ پھر کالیکٹ کی چھینٹ، ڈھنی فولاد اور لوہے کی چیزوں، خاصہ اور ململ، قالین بافی اور شطرنجیوں، رومالوں ساڑیوں اور طرح طرح کے کاغذ کے کارخانوں سے اس سلطنت کے شہرت میں چار چاند لگ گئے تھے۔ صنعت و حرفت کا اتنا چرچا تھا کہ بیکار اور گداگر دیکھنے میں نہیں آتے تھے۔ ہندؤں مسلمانوں میں

کامل اتحاد تھا اور عید بقرعید میں ہندو مسلمانوں کی طرح خوشیاں
مناتے تھے تو مسلمان ہولی دیوالی کو خود اپنا تہوار سمجھتے تھے۔ یہ تو
ظاہری شان تھی لیکن افسوس ہے کہ اس دولت کی فراوانی کی وجہ
سے لوگوں میں کاہلی سستی عیش و عشرت اور طرح طرح کی برائیاں
پیدا ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے سلطنت کی جڑ بالکل کھوکھلی ہو گئی
تھی، چنانچہ جب موقع ملا تو پہلے تو مرہٹوں نے سلطنت کو اپنے
حملوں سے بے دم کیا اور پھر جو رہا سہا تھا اس کا عالمگیری فوج
نے خاتمہ کر دیا۔ ابتدا میں تو مرہٹے اور بیجاپوری دونوں شہنشاہی
افواج کے مقابلے کے لئے متحد ہو گئے اور مرزا راجہ جے سنگھ کو بیجاپور
سے واپس اورنگ آباد کو بھگا دیا، لیکن ایک طرف تو بیجاپوری امراء
کے ماہین طرح طرح کے جھگڑے پیدا ہو گئے اور آپس میں پھوٹ پڑ گئی
اور دوسرے شیواجی نے خود تنجور اور جنجی تک کا ملک اپنی ریاست میں
ملا کر سکندر عادل کو رائچور کا دوآبہ اس کے حوالہ کرنے پر مجبور کیا۔
اورنگ زیب کے بدن میں شیواجی اور بیجاپور دونوں خار تھے، اور اس
بہانے سے کہ سکندر عادل نے کیوں شیواجی سے ساز باز کیا عادل شاہی
سلطنت پر حملہ کرنے سے پہلے وہ خود شولاپور گیا اور آخر کار ۱۶۸۶ء میں
بیجاپور فتح کر کے عادل شاہی سلطنت کا ہمیشہ کے واسطے خاتمہ
کر دیا۔

۷۔ پرانی دکھنی سلطنتوں میں صرف ایک یعنی گولکنڈہ

باقی رہ گئی جس کا پائے تخت اب حیدرآباد تھا۔ یہاں شاہجہاں کے تخت نشینی پر عبداللہ قطب شاہ حکمراں تھا۔ اس کے دربار میں عیش و عشرت اور رنگ رلیوں کا بازار گرم تھا اور کسی کو یہ خبر نہ تھی کہ ایک طاقت ور دشمن تاک لگائے بیٹھا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ گو یہاں بھی دوسری ریاستوں اور سلطنتوں کی طرح ہندو اور مسلمانوں میں بیحد یگانگت تھی اور پیشوائی یعنے وزارت تک پر ہندو فائز ہوتے تھے، پھر بھی سلطنت میں امیر امراؤ عہدہ دار عہدہ دار ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے تھے، یہاں تک کہ محمد سعید ایرانی جو سلطنت کا میر جملہ یا وزیر اعظم تھا، عبداللہ سے ناراض ہو کر اورنگ زیب کی طرف چلا گیا اور اس سے کہ کر مغلوں سے حیدرآباد پر حملہ کرا دیا۔ جب شہزادہ محمد سلطان کا شہر حیدرآباد پر قبضہ ہو گیا تو اس وقت عبداللہ کی آنکھیں کھلیں اور جو جو شرطیں مغلوں کی طرف سے پیش ہوئی تھیں وہ سب قبول کرنی پڑیں، یعنے ایک کروڑ روپیہ جو خراج کا بقایا تھا وہ دیا، اپنی بیٹی کی شادی شہزادہ محمد سلطان سے کر دی اور میر جملہ کے عزیز واقربا کو قید سے رہا کر دیا۔ عبداللہ کے بعد اس کا داماد ابوالحسن عرف تاناشاہ تخت گولکنڈہ پر بیٹھا۔ اس نے غلطی یہ کی کہ علی الاعلان شہنشاہی دشمنوں سے جا ملا۔ یعنے ایک تو شیواجی کے گدی نشینی کے بعد اس کے ساتھ ملاپ کر لیا اور دوسرے جب بیجا پور پر مغلوں نے حملہ کیا

تو اس نے اپنی فوجیں اس کی مدد کو بھیجنا چاہیں۔ الغرض عالمگیر نے گولکنڈہ پر چڑھائی کر کے اسے بھی اپنی شرطیں قبول کرنے پر مجبور کیا۔ لیکن ابوالحسن کب چین سے بیٹھ سکتا تھا، اور جب اورنگ زیب نے دیکھا کہ وہ شیواجی کے بیٹے سنبھاجی سے بھی میل ملاپ کر رہا ہے تو اس پر نہ رہا گیا اور اس نے آخرکار خود جا کر گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس محاصرہ میں اورنگ زیب کی ہمراہی میں اس کی فوج کے سپہ سالار جرار عابد قلیچ خان وہی شخص تھے جن کے پوتے حضرت آصف جاہ اول کی اولاد آج تک تخت حیدرآباد پر جلوہ افروز ہے۔ عظیم الشان عالمگیری لشکر کے باوجود گولکنڈہ والوں نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور عبدالرزاق لاری جیسے بہادروں نے شجاعت کے وہ کرشمے دکھائے کہ دشمن بھی داد دئے بغیر نہ رہے۔ لیکن ہُوا وہی جو ہونا تھا یعنی ۱۶۸۷ء میں کئی مہینے کے محاصرہ کے بعد آخرکار گولکنڈہ پر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح تمام ملک ہند پر ایک ہی شہنشاہ کا سکہ چلنے لگا۔

۸ — بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح سے چند سال پہلے شیواجی کا انتقال ہو چکا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا سنبھاجی مرہٹوں کا راجہ بن بیٹھا تھا۔ گو اس میں بھی اپنے باپ کے سے داؤں پیچ آتے تھے اور وہ خود دُور دُور مغلوں کے علاقوں پر چھاپے مارتا اور بیگناہوں کا خون کر کے وہاں کے باشندوں اور حکاموں سے روپیہ وصول کرتا تھا۔

لیکن فرق یہ تھا کہ شیواجی کو تو بچپن سے مذہبی تعلیم و تربیت ملی
تھی اور گرو رام داس جیسے بزرگوں کی صحبت میں رہا تھا سنبھاجی
میں وہی عادتیں تھیں جو ان پڑھ لٹیرے میں ہونی چاہئیں جس
کی وجہ سے خود اس کے ہم قوم مرہٹے بھی اس سے نفرت کرنے
لگے تھے۔ آخر کار وہ شہنشاہی حکام کے ہاتھ لگ گیا اور اسے
شہنشاہ کے حکم سے موت کی سزا دی گئی اس کے بیٹے شاہو کو
شہنشاہ نے نہایت محبت سے اپنے ہمراہ ہی میں جگہ دی اور اس
کی نہایت شفقت سے پرورش کی۔ سنبھاجی کا تو خاتمہ ہو گیا لیکن
اس کی قوم ابھی تک زندہ تھی چنانچہ سنبھاجی کی بیوہ تارا بائی
نے کمال بہادری اور ہمت سے مرہٹوں کو از سر نو متحد کیا اور راجہ رام
کو متولی بنا کر تمام مرہٹہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔

۹۔ محی الدین اورنگ زیب بادشاہ نے پچاس برس
حکومت کر کے ۱۷۰۷ء میں دکن ہی میں انتقال کیا اور دولت آباد
کے قریب خلد آباد کے مقام پہ سینکڑوں اولیاء کرام اور
بزرگان دین کے قریب دفن کیا گیا۔ اس نے وصیت کی تھی
کہ میری قبر بالکل کچی بنائی جائے اور کسی قسم کا گنبد یا مقبرہ
تعمیر نہ کیا جائے لیکن اس کچی قبر میں آج بھی اس کے انتقال سے
سوا دو سو برس بعد بھی ایسا رعب برستا ہے کہ بیان سے باہر ہے
جتنی بڑی سلطنت اس بادشاہ کی تھی اتنی بہت کم بادشاہوں کی

ہو گئی یعنی وہ بلخ اور افغانستان سے لے کر آسام تک اور جنوب میں تقریباً راس کماری تک سب حصوں کا مالک تھا۔ اس کی ہمّت اور شجاعت دیکھو کہ نوّے برس کی عمر میں بھی وہ میدان جنگ اور سپاہیانہ زندگی سے نہیں گھبراتا تھا، اور اس سادگی انصاف پسندی آج تک مشہور و معروف ہیں۔ بعض لوگ بڑے سے بڑے آدمیوں کو بھی بُرا بھلا کہتے ہیں، چنانچہ اورنگ زیب بھی اس سے نہیں بچ سکا، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس عادت و خصلت اس محنت و مشقت اور اس ترتیب و تنظیم والے بادشاہ بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں۔

باب ۱۰

دکھنی حالات

اعظم شاہ کے اعلان شہنشاہی سے آصف جاہ اول کے تسلط تک

(۱۷۰۷ء تا ۱۷۲۳ء)

۱۔ جب اورنگ زیب کا انتقال ہوا ہے تو اس کا سب سے بڑا بیٹا بہادر شاہ تو کابل میں تھا اور اس کا دوسرا بیٹا اعظم شاہ باپ کے پاس دکن ہی میں تھا۔ چنانچہ اعظم نے فوراً احمد نگر آکر اپنی شہنشاہی کا اعلان کیا اور منجملہ دوسرے امراء کے غازی الدین خاں فیروز جنگ اور ان کے بیٹے نواب چین قلیچ خاں کو اپنے ساتھ لے کر سیدھا آگرہ کی طرف چلا۔ باوجود تار اور ریل نہ ہونے کے اس زمانے میں ڈاک کا انتظام اتنا اچھا تھا کہ اعظم کے آگرے پہنچنے سے پہلے ہی بہادر آگیا اور اپنے بھائی سے کہلا بھیجا کہ میاں تم دکن ضرور لے لو لیکن بحیثیت بڑے بیٹے ہونے کے شہنشاہی کا حق تو مجھے ہے۔ اعظم کب ماننے والا تھا، اور آخر وہ بڑے بھائی سے جنگ آزما ہوگیا، لیکن لڑائی میں وہ اور اس کا بیٹا دونوں کام آئے۔ بہادر شاہ تخت

پڑا تھا کہ اسے اپنے سب سے چھوٹے بھائی شہزادہ کام بخش کی بغاوت سے دوچار ہونا پڑا جس نے حیدر آباد کو اپنا پایۂ تخت بنا کر وہاں اور بیجا پور میں اپنے نام کا خطبہ اور سکہ رائج کر دیا تھا۔ کام بخش بڑا متکبر اور مغرور تھا اور اپنے مقصدوں کے حاصل ہونے کے سامنے کسی چیز کی پروا نہیں کرتا تھا، اور ظاہر ہے کہ جس کسی میں یہ عادتیں ہوں اس سے بڑا چھوٹا کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ بہادر شاہ کی غیرت اور محبت دیکھو کہ باوجود اس بغاوت کے اس نے اپنے نالائق بھائی سے سختی کرنے کے بجائے اس کے پاس پیام بھیجا کہ تم شوق سے حیدر آباد اور بیجا پور کا علاقہ لے لو اور تم کہو تو میں تمہیں تمام جنوبی ممالک کا ناظم بھی بنا دوں گا، لیکن یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ میں اور تم بیکار لڑیں اور بے گناہوں کا خون بہائیں، کام بخش اپنے زور کے گھمنڈ میں تھا چنانچہ بجائے اس کے کہ دکن کے علاقے پر قانع ہوتا اس نے اپنے بڑے بھائی سے لڑائی لڑی اور اعظم کی طرح خود بھی کام آیا۔

۲ ۔ بہادر شاہ اوّل نے صرف چار برس سلطنت کی۔ اس کے انتقال کے بعد حسب معمول پھر اس کے بیٹوں میں خانہ جنگی ہوئی جس کی وجہ سے سلطنت کی بنیادیں پہلے سے بھی زیادہ کھوکھلی ہو گئیں۔ بہادر کے سب سے چھوٹے بیٹے عظیم الشان نے پہلے تو شاہی خزانہ پر قبضہ کیا اور اس کے بعد بادشاہی کا اعلان کر دیا، لیکن اس کے باقی

تینوں بھائیوں نے آپس میں اتحاد کر کے اسے شکست دے دی اور اس کا خاتمہ کر دیا۔ اب یہ تینوں آپس میں لڑ پڑے اور آخر کار ان میں سے ایک یعنی جہاندار شاہ تخت پر بیٹھا۔ یہ ایک نہایت بُرا اور بد اخلاق شخص تھا اور اس سے ہر شخص سخت ناراض اور نالاں تھا۔ پھر اس کے وزیر ذوالفقار خاں کا تکبر اور غرور بھی حد سے بڑھ گیا تھا۔
الغرض دو بھائیوں، یعنی سید حسین علی اور سید عبداللہ نے سازش کر کے جہاندار کے بھتیجے فرخ سیر صوبہ دار بنگالہ کو بلایا اور چونکہ جہاندار کے نالائق حرکتوں کی وجہ سے بہت کم لوگ اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھے اس لئے فرخ سیر نے اسے شکست دے کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے تخت پر بیٹھتے ہی عبداللہ کو نواب قطب الملک کے خطاب سے وزیر اعظم اور حسین علی کو امیر الامرا کے خطاب سے سپہ سالار بنا دیا۔ دوسرے امرا کی طرح نواب چین قلیچ خاں بھی جہاندار کے مخالف اور شہنشاہ فرخ سیر کے مؤید تھے، چنانچہ انہیں اب نواب نظام الملک آصف جاہ کا خطاب دے کر دکن کا صوبہ دار مقرر کر دیا گیا اور انھوں نے اورنگ آباد جا کر اس کا جائزہ لے لیا۔
۳ ۔ بھائیوں بھائیوں کی لڑائی کا جو نتیجہ ہمیشہ ہوا کرتا ہے وہی ہوا اور دولت ہند جسے اکبر، شاہجہاں اور عالمگیر نے اس قدر محنت سے متحد کیا تھا، اب باہمی نااتفاقی کا شکار ہو رہی تھی،

جس کا اثر ملک کے ہر کونے پر پڑ رہا تھا۔ بہادر شاہ جب اپنے بھائی
اعظم کو شکست دینے کے بعد شمال آیا ہے تو اس نے شاہو جی کو رہا
کر کے مرہٹوں کا راجہ بنا دیا تھا۔ ادھر تارا بائی یہ کب گوارا کر سکتی تھی
کہ اس کا سوتیلا بیٹا تو راجہ بن جائے اور اس کا اپنا بیٹا محروم رہے چنانچہ
اس نے اپنے بیٹے کو شاہو کا مدمقابل بنا کر کولھاپور میں تخت پر بٹھا دیا۔
اب بھی شہنشاہی نام کا اتنا اثر تھا کہ جب مرہٹوں کی خانہ جنگی میں بجائے
تارا بائی کے شاہو جی کو کامیابی ہوئی لیکن اس خانہ جنگی کا ایک نتیجہ
یہ ہوا کہ دہلی کے بادشاہوں کی طرح خود شاہو کا خاندان کمزور ہو گیا
اور اس کا پیشوا (وزیر اعظم) جو پونا میں رہتا تھا مہاراشٹر کا سب
سے بڑا اور سب سے اقتدار والا شخص بن گیا۔ یہ زمانہ دکن کے انتہائی
پستی کا زمانہ تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر کے وفات کے بعد دکن ہی
میں اکثر خانہ جنگی کی لڑائیاں ہوتی رہیں اور اس ملک پر کبھی کوئی فوج
چھاپے مارتی تھی کبھی کوئی دعویدار تاراجی پھیلاتا تھا کبھی
دلی صوبے دار آکر بیچاری رعایا کو دق کرتا تھا اور جو رہا سہا تھا اس
رہٹے آکر خاتمہ کر ڈالتے تھے۔ عالمگیر نے دکھنی گھوڑوں کی نسل
پہلے سے بہتر بنانے کی بڑی کوشش کی تھی اور بہترین گھوڑے لا کر
ان گاؤں تقسیم کر دیئے تھے۔ اب خانہ جنگی اور بھائی بھائی کے
یوں کی وجہ سے جو افرا تفری پھیلی اس کے باعث ان گھوڑوں اور
کے بچھیڑوں کی کوئی پوچھ نہیں رہی اور یہ سب کے سب مرہٹے

سواروں کے ہاتھ میں آگئے جن کی وجہ سے مرہٹہ سوار تمام ملک
میں مشہور ہوگئے۔ ان ہی کی مدد سے مرہٹوں کو اتنا فروغ پہنچا کہ
سلطنت دہلی کے ماتحت ہونے کے باوجود وہ اس کے دکھنی صوبوں
میں لوٹ مار کرنے لگے اور صوبہ دار سے جبراً چوتھ یعنے آمدنی کا ایک
چوتھائی حصہ وصول کرنے لگے یہاں تک کہ برہان پور سے لے کر
سورت تک مرہٹہ رہزنوں اور ڈاکوؤں نے قلعوں کی گویا ایک زنجیر
تیار کر لی۔

۴۔ نظام الملک آصف جاہ بہادر کے دکن جانے سے یہ سب
خرابیاں رفع ہو جاتیں لیکن قطب الملک اور امیر الامرا کو وہ کانٹے
کی طرح کھٹکتے تھے۔ چنانچہ ان دونوں نے یہ سوچا کہ کسی چھوٹے
صوبہ کا جائزہ دے دیا جائے۔ الغرض نظام الملک کو مرادآباد کا
صوبہ دے دیا گیا اور امیر الامرا صوبہ دار دکن بن بیٹھا۔ دیکھو شہنشاہ
ہند فرخ سیر اس قدر کمزور تھا کہ یہ سب اس کی مرضی کے خلاف
کیا گیا تھا۔ اور اس نے فوراً دکن کے نائب صوبہ دار کو لکھا کہ تم
امیر الامرا کی مخالفت کرنا، اور جب امیر الامرا نے جبراً صوبہ دکن پر ق
کر لیا تو شاہو کو اس قسم کا خفیہ پیغام بھیجا کہ تم ہمارے صوبہ دار سے
چوتھ کا مطالبہ کرنا۔ امیر الامرا مرہٹوں سے ڈرتا تھا، اس لئے ا
نے کمال چالاکی سے شاہو کو چوتھ دینے کا وعدہ کیا اور تمام صوبہ دکن
اسی کے سپرد کر کے اپنے مخالفوں کا بلکہ خود بادشاہ کا خاتمہ کرنے کے

دہلی کی راہ لی۔ دہلی آکر اس نے تاریخ میں پہلی مرتبہ دکھنی مرہٹوں کو دہلی کے ہر مقام پر اور خود قلعہ معلّیٰ میں متقرر کیا اور فرخ سیر سے سلطنت کے کاروبار سے استعفیٰ لے کر شاہزادہ رفیع الدرجات کو ڈگمگاتے ہوئے تخت پر بٹھا دیا۔ ساتھ ہی اب یہ بادشاہ گر سید سمجھنے لگے تھے کہ نظام الملک سے کسی طرح چھٹکارا ملنا چاہیئے" اس لیئے انھوں نے انہیں مالوہ کا صوبے دار بنا دیا۔ اس بادشاہ گری اور دوسری حرکتوں کی وجہ سے ان سیدوں کی مخالفت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ چنانچہ بیسیوں امیر اور سیکڑوں لوگ دہلی چھوڑ چھوڑ کر نظام الملک کے ساتھ مالوے چلے گئے۔ بیچارا بادشاہ ان سیدوں کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی بنا ہوا تھا اور اسے حکومت سے مطلق کچھ سروکار نہیں تھا۔ وہ زیادہ دن تک اس دنیا میں نہیں رہا بلکہ چند ہی ماہ سلطنت کرنے کے بعد دق کے مرض میں مبتلا ہو کر مرگیا۔ اس کے بعد سیدوں نے اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو شاہ جہاں ثانی کے لقب سے تخت پر لاکر بٹھا دیا لیکن اس پر رفیع الدرجات سے بھی زیادہ پابندیاں تھیں اور وہ بھی کچھ دن بے کار تخت پر بیٹھے رہنے کے بعد خدا کے گھر چلا گیا۔ اب امیرالامرا اور قطب الملک نے جہاندار شاہ کے بڑے بیٹے شہزادہ روشن اختر کو زندان سے نکال کر محمد شاہ کے خطاب سے تخت پر بٹھایا اور اس کے نام سے سلطنت ہند پر حکومت کرنے لگے۔

۵۔ شاید تمام سلطنت میں صرف ایک امیر ہی ایسا تھا جس نے

ان سب سازشوں اور برائیوں سے اپنے آپ کو الگ تھلگ رکھا تھا اور وہ نظام الملک آصف جاہ تھے۔ انھوں نے امیر الامرا کا ساتھ نہیں دیا تھا اس لئے سید برادران ان سے مشتبہ تھے۔ محمد شاہ بادشاہ کی دادی یعنے بہادر شاہ کی بیوہ ایک نہایت عقلمند ملکہ تھی اور جب اس نے دیکھا کہ شہنشاہ کے اختیارات بمنزلہ صفر کے رہ گئے ہیں تو اس نے بہت کچھ سوچ سمجھ کر نظام الملک سے کہا کہ اب موقعہ ہے اور سلطنت کے کسی ٹکڑے کو بچانا ہے تو تم دکن چلے جاؤ۔ نظام الملک نے یہ سنتے ہی سیدھا برہان پور کا رخ کیا اور دریائے پورنا کے کنارے امیر الامرا کے بھتیجے عالم علی خاں کو شکست دی۔ یہ سن کر امیر الامرا پر اور کچھ تو ہو نہ سکا محمد شاہ کو لے کر سیدھا دکن کی طرف چلا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ میری بدکاریوں اور مظالم کی وجہ سے تو میرے لشکر والے وفادار نہیں ہیں اور خود بادشاہ کی دادی میرے خلاف ہے۔ الغرض دہلی سے کچھ ہی منزل آگے گیا ہوگا کہ وہ خود امرا کی ایک سازش میں پھنس کر کام آیا۔ آصف جاہ نے یہ سن کر کہ سلطنت کا واقعی دشمن کام آیا ہے فوراً اپنے بادشاہ کی وفاداری کا اعلان کیا اور ہتیار ڈال دیئے چنانچہ قطب الملک کی گرفتاری کے بعد بادشاہ نے آصف جاہ کو سلطنت کا وزیر اعظم مقرر کر کے دہلی واپس بلالیا۔

۷۔ دہلی پہنچ کر آصف جاہ نے کچھ اور ہی رنگ دیکھا کہ آپس کی سازشوں اور لڑائیوں جھگڑوں کی وجہ سے سلطنت کی بنیاد بالکل

کھوکھلی ہوگئی ہے اور یہ عظیم الشان ایوان گرا چاہتا ہے۔ حضرت آصف جاہ نہایت ہوشیار اور بڑے مدبر تھے اور انھوں نے یہ بھانپ لیا کہ اگر سلطنت کا کوئی حصہ محفوظ رہ سکتا ہے تو وہ دکن ہے اور اگر کوئی شخص اسے بچا سکتا ہے تو میں خود ہوں۔ الغرض وہ ایک روز شکار کا بہانہ کر کے مالوہ کی طرف چلے اور وہاں مرہٹوں کی بغاوت فرو کرنے کی غرض سے احمد آباد کا رخ کیا۔ جب انہیں نائب صوبہ دار دکن مبارز خان کی بغاوت کی خبر ملی تو وہ اس کے پیچھے چلے اور اسے برآرمیں شکر کھیڑے کے مقام پر سخت شکست دی۔ جب محمد شاہ نے یہ سب سُنا تو اس نے بھی اپنی خوشنودی کا فرمان آصف جاہ کے پاس بھیجا اور انہیں ہدایت کی کہ باغیوں کا سر کچل دو اور میری عزیز رعایا کی بہتری کے خاطر ملک میں امن و امان قائم کرنے کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کہ دہلی سے اس قسم کا یا کوئی دوسرا حکم آنے کا آصف جاہ پر کیا اثر ہو سکتا تھا اس لئے کہ انھوں نے تو دکن گویا شکر کھیڑے کے مقام پر فتح کیا تھا، تاہم انھوں نے اس فرمان شہنشاہی کی بڑی تعظیم و توقیر کی اور ۱۷۲۴ء میں حیدرآباد جاکر اور اپنی حاصل کی ہوئی حکومت کا براہ راست جائزہ لے لیا، اور ساتھ ہی اپنی حکومت میں فرمان شاہی کے سب اصول پیش نظر رکھ کر اپنی کمال ہوشیاری اور وفاداری کا ثبوت دیا۔ اب ہم تاریخ کے دکن کے دوسرے عہد کے خاتمہ پر پہنچ گئے ہیں، وہ عہد جو بہمنیوں

کے آزادی پر شروع ہوتا ہے اور اب آصف جاہیوں کے استقلال پر ختم ہوتا ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ آصف جاہ کو شکر کھیڑے پر خدانخواستہ شکست ہو جاتی تو ہمارے عزیز وطن یعنی دکن کا وہی حشر ہوتا جو ہندوستان کے دوسرے حصوں کا ہوا۔

تتمۂ حصہ دوم

شجرۂ سلاطین بہمنیہ

(۱) علاء الدین حسن گنگو بہمن شاہ سنہ ۱۳۴۷–۱۳۵۷ء

(۲) محمد اول سنہ ۱۳۵۷–۱۳۷۴ء

(۳) مجاہد سنہ ۱۳۷۴–۱۳۷۷ء

(۴) داؤد شاہ سنہ ۱۳۷۸

(۵) محمود اول سنہ ۱۳۷۸–۱۳۹۷

(۶) غیاث الدین ۱۳۹۷ء

(۷) شمس الدین سنہ ۱۳۹۶ء

(۸) فیروز سنہ ۱۳۹۷–۱۴۲۲ء

(۹) احمد سنہ ۱۴۲۲–۱۴۳۴ء

(۱۰) علاء الدین دوم سنہ ۱۴۳۶–۱۴۵۷ء

(۱۱) ہمایوں سنہ ۱۴۵۷–۱۴۶۰ء

(۱۲) نظام سنہ ۱۴۶۱–۱۴۶۲ء

(۱۳) محمد دوم سنہ ۱۴۶۳–۱۴۸۲ء

(۱۴) محمود دوم سنہ ۱۴۸۳–۱۵۱۸ء

(۱۵) احمد دوم سنہ ۱۵۱۸–۱۵۲۰ء

(۱۶) علاء الدین سوم سنہ ۱۵۲۰ء

(۱۷) ولی اللہ سنہ ۱۵۲۰–۱۵۲۳ء

(۱۸) کلیم اللہ سنہ ۱۵۲۲–۱۵۲۶ء

شجرہ خاندان بریدیہ (بیدر)

- (۱) قاسم برید ۱۴۹۲/۱۵۴۹ء
  - (۲) امیر ۱۵۰۴/۱۵۴۹ء
    - (۳) علی ۱۵۴۹/۱۵۶۲ء
      - (۴) ابراہیم ۱۵۶۲/۱۵۶۹ء
      - (۵) قاسم دوم ۱۵۶۹/۱۵۷۲ء
        - (۶) علی دوم ۱۵۷۲/۱۶۰۹ء

شجرۂ خاندان عماد شاہیہ (برار)

---

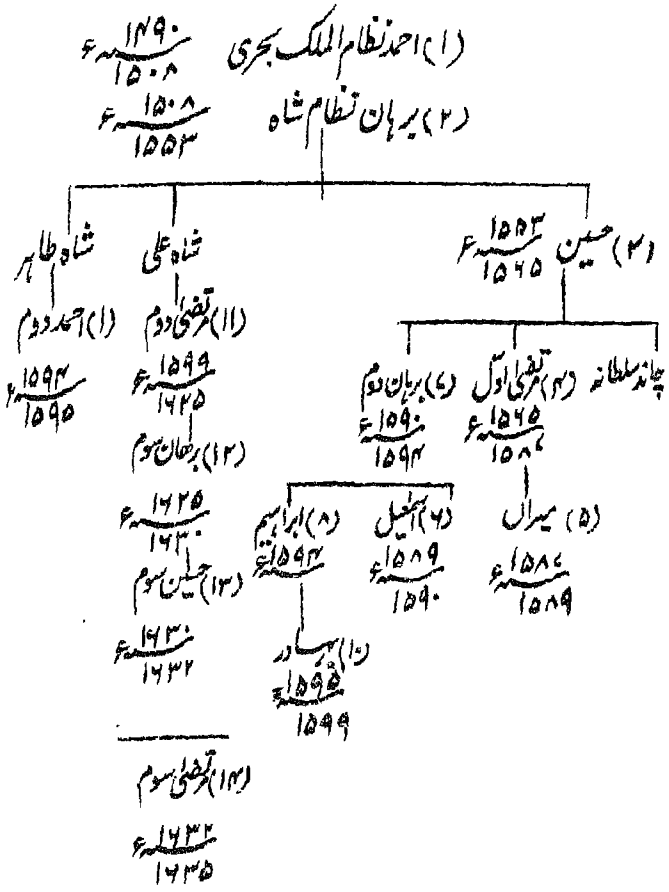
(۱) فتح اللہ عماد الملک — ۱۴۸۳/۱۵۰۴ء

(۲) علاء الدین عماد شاہ — ۱۵۰۴/۱۵۲۸ء

(۳) دریا — ۱۵۲۸/۱۵۶۰ء

(۴) برہان — ۱۵۶۰/۱۵۶۸ء

شجرۂ خاندان نظام شاہیہ (احمد نگر)



شجرۂ خاندانِ عادل شاہیہ (بیجاپور)

(۱) یوسف عادل شاہ سنہ ۱۴۸۹ – ۱۵۱۱ء

(۲) اسمٰعیل سنہ ۱۵۱۱ – ۱۵۳۴ء

(۳) ملّو سنہ ۱۵۳۴ – ۱۵۳۵ء

(۴) ابراہیم اول سنہ ۱۵۳۵ – ۱۵۵۷ء

(۵) علی اول سنہ ۱۵۵۷ – ۱۵۷۹ء

(۶) ابراہیم دوم سنہ ۱۵۷۹ – ۱۶۲۶ء

(۷) محمد سنہ ۱۶۲۶ – ۱۶۵۶ء

(۸) علی دوم سنہ ۱۶۵۶ – ۱۶۵۹ء

(۹) سکندر سنہ ۱۶۵۹ – ۱۶۸۶

شجرۂ خاندان قطب شاہیہ (گولکنڈہ)

(۱) سلطان قلی قطب شاہ سنہ ۱۵۱۸ — ۱۵۴۳ء

- (۲) جمشید قلی سنہ ۱۵۴۳ — ۱۵۵۱ء
- (۳) سبحان قلی سنہ ۱۵۵۰ء
- (۴) ابراہیم قلی سنہ ۱۵۵۰ — ۱۵۸۱ء
  - (۵) محمد قلی سنہ ۱۵۸۱ — ۱۶۱۱ء
    - (۶) محمد سنہ ۱۶۱۱ — ۱۶۳۶ء
      - (۷) عبداللہ سنہ ۱۶۳۶ — ۱۶۷۲ء
        - دختر = (۸) ابوالحسن سنہ ۱۶۷۲ — ۱۶۸۷ء

تیسرا حصہ

زمانہ حالیہ

(از سنہ ۱۷۲۴ء)

باب ١١

حضرت آصف جاہ اول

(سنہ ۱۷۲۴ء تا سنہ ۱۷۴۸ء)

١۔ جس وقت حضرت آصف جاہ نظام الملک بہادر نے یہ طے کیا ہے کہ دہلی کی سلطنت کا اب کوئی ٹھیک نہیں لہذا مناسب ہے کہ دکن ہی کو دوسروں سے بچایا جائے۔ اس وقت صوبہ دکن سلطنت ہند کے سب صوبوں سے بڑا اور شاید سب سے زیادہ اہم تھا اور اس میں دریائے تاپتی سے لے کر تقریباً تمام جنوبی ہند شامل تھا۔ گو اس میں شبہ نہیں کہ کرناٹک کے علاقے پر صوبہ دار دکن کا ایک نائب (نواب) حکومت کرتا تھا جس کا مستقر ارکاٹ تھا، اور شمال و مشرقی ساحل کے راجے مہاراجے اپنی اپنی پیش کش ایک نواب کے وساطت سے ادا کرتے تھے جو عام طور پر راج مندری رہتا تھا، لیکن یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ یہ نواب موروثی تھے، بلکہ دراصل یہ محض سلطنت کے عہدہ دار تھے اور ان کے تقرر کرنے اور برخاست

کرنے کا پورا اختیار صوبہ دار دکن یعنی حضرت آصف جاہ کو حاصل تھا۔

۲۔ حضرت آصف جاہ نے دکن کو اپنا مستقل مستقر بناتے ہی یہاں کے انتظامات کو یکسو کیا۔ انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ ہندو مسلمانوں دونوں سے اپنی ریاست کے قیام اور استحکام میں مدد لی یعنے زیادہ تر انتظامی امور ہندوؤں کے اور فوجی مسلمانوں کے سپرد کر دیے۔ پھر بجائے اس کے کہ وہ تمام صوبہ کو اپنی ذاتی ملک قرار دیں انھوں نے اسے تین حصوں یعنے صرف خاص، دیوانی اور جاگیرات میں تقسیم کیا اور صرف ایک حصے یعنے صرف خاص سے اپنی ذاتی ضروریات پوری کرنے کو کافی سمجھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے بڑے بڑے قطعات لوگوں کو ٹھیکہ پر دے دیئے تاکہ وہ خود مالگزاری وصول کرنے سے آزاد ہوجائیں۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں امن وامان پیدا ہوگیا اور دربار دہلی کے بعد ہندوستان کا کوئی ایسا دربار نہیں تھا جو دولت وحشمت میں حکمران وسپہ سالار دکن کے دربار کا مقابلہ کر سکے۔

۳۔ آصف جاہ اول کو سب سے بڑا کھٹکا مرہٹوں کی طرف سے لگا رہتا تھا۔ تم یہ تو پڑھ چکے ہو کہ آپس کے لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے سیواجی کے جانشینوں کی قوت روز بروز کم ہوتی جاتی تھی اور ان کی جگہ ان کے وزرا جنھیں "پیشوا" کا لقب تھا روز بروز اپنا اقتدار بڑھاتے جاتے تھے۔ پہلا پیشوا جس نے آخر کار اپنے اختیارات اپنے آقا کے اختیارات سے زیادہ کر لیے بالاجی وشواناتھ تھا۔ بالاجی

کے زمانہ میں مرہٹوں کی پیشوائی موروثی بن گئی اور اس کے بعد سے
لے کر تقریباً سو برس تک مرہٹوں کے سیاسی رہبری کا کام راجہ
کے سپرد نہیں تھا بلکہ اس کے موروثی وزیر اعظم یعنی پیشوا کے سپرد
تھا۔ بالاجی کے بعد اس کا بیٹا باجی راؤ پیشوائی کی گدی پر بیٹھا اور
اس نے اپنی حیثیت اپنے باپ سے بھی زیادہ مضبوط کر لی۔ اس نے
صرف مہاراشٹر پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر مالوے کو تاراج
کیا۔ اور جب محمد شاہ بادشاہ نے دیکھا کہ میرا بس نہیں چلتا تو اس
نے اپنے وفادار صوبہ دار نظام الملک آصف جاہ کو دہلی طلب کیا۔
مگر دہلی میں آصف جاہ کے بہت سے دشمن بھی تھے، چنانچہ جب
بالاجی راؤ نے دیکھا کہ آپس میں تفرقے پڑے ہوئے ہیں تو اس کی
چڑھ بنی اور ایک فریق کو اپنے ساتھ ملا کر اس نے بادشاہ کے سامنے
ایک بڑی رقم بطور نذر کے پیش کر اپنے آپ کو تمام صوبۂ دکن کا سردیس پانڈیہ
مقرر کر لیا جس کی وجہ سے اب اسے اس صوبہ سے چوتھ اور
دس فی صدی سردیش مکھی لینے کا حق حاصل ہو گیا۔ اس نے آصف جاہ
کی دکن کو واپسی پر انہیں بھی دق کرنا شروع کیا جس کی وجہ
سے انہیں مالوے کی صوبے داری سے (جس پر محمد شاہ نے انہیں
فائز کیا تھا) دست بردار ہونا پڑا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ آصف جاہ
کو نادر شاہ بادشاہ ایران کے حملہ کے وقت دہلی طلب کیا گیا لیکن
سلطنت کی حالت اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ آصف جاہ جیسا

مدبر بھی اسے سنبھال نہ سکا، اور انھوں نے بے حد رنج و افسوس کے ساتھ اکبر اور اورنگ زیب کے سلطنت کو نادر شاہ کے پاؤں کے نیچے لوٹتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد وہ جو دکن واپس آئے تو پھر کبھی دہلی نہیں گئے۔

۴۔ ہمیں معلوم ہے کہ جب آصف جاہ نے دکن پر مستقل قبضہ کیا ہے تو نہ صرف حیدرآباد بلکہ تمام جزیرہ نما جس میں نربدا سے راس کماری تک شامل تھا ان کے ماتحت تھا اور وہی کرناٹک کے نائبوں کو جسے "نواب" کا خطاب تھا مقرر کرتے تھے۔ آصف جاہ کے دکن آنے کے چند سال بعد نواب کرناٹک کے انتقال پر اس کے خاندان والوں نے نوابی کو موروثی کرنے کی کوشش کی اور اس کے داماد حسین دوست خاں عرف چندا صاحب نے تو اپنی قوت سے ترچنا پلی تک فتح کر لیا۔ ظاہر ہے کہ نواب آصف جاہ کو یہ کب پسند تھا کہ کرناٹک ان کی ماتحتی سے نکل جائے اور وہاں کے نواب کی قوت حد سے بڑھ جائے۔ ادھر مرہٹوں نے آصف جاہ کے اشارے سے میسور کے راجہ سے مل کر کرناٹک پر حملہ کر دیا اور آخر کار چندا صاحب کو ترچنا پلی سے دست بردار ہی ہو جانا نہیں پڑا بلکہ اسے مرہٹوں نے گرفتار کر کے ستارا بھیج دیا۔ ان واقعات کے سال بھر بعد جب چندا صاحب کے نسبتی بھائی صفدر خاں نواب کرناٹک کا انتقال ہوا ہے تو اس وقت کرناٹک کا انتظام کرنے کی غرض سے نواب آصف جاہ

خود ارکاٹ گئے۔ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں جنوبی ہند میں اتنی افراتفری پھیلی تھی کہ ارکاٹ میں ان کے پاس یکے بعد دیگرے اٹھارہ نواب آئے اور کہا کہ کرناٹک کے نواب ہم ہیں، جس پر نواب آصف جاہ نے یہ کہہ کر کہ کرناٹک میں تو ایک نواب ہونا چاہیے نہ کہ اٹھارہ، یہ حکم دیا کہ اب جو شخص اپنے آپ کو نواب کہلوائے اسے نکال باہر کردو۔ الغرض میر انور الدین خاں نواب شہامت جنگ کو نواب کرناٹک مقرر کر کے وہ اپنے مستقر واپس آ گئے۔

۵۔ جب حضرت آصف جاہ ارکاٹ میں تھے تو اس وقت سب سے پہلے ایک انگریز ایلچی کو ان کا شرف باریابی حاصل ہوا۔ تم اس سے پہلے یہ پڑھ چکے ہو کہ بہمنی عہد میں پرتگیزوں نے آکر مغربی ساحل ہند پر چند مقامات پر قبضہ کر کے ان میں اپنی عملداری قائم کر لی تھی۔ ان پرتگیزوں نے اپنے علاقے میں لوگوں کو جبراً عیسائی بنانا شروع کیا اور اپنی بیچاری رعایا پر طرح طرح کی سختیاں کرنی شروع کیں جس کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں ملنی دشوار ہے۔ تم نے یہ دیکھا ہے کہ مسلمان کیسے صدیوں سے اس ملک میں ہندوؤں اور دوسرے مذہب والوں کے ساتھ رہتے ہیں اور کبھی صرف مذہب کی خاطر کسی مسلمان بادشاہ نے بے گناہ غیر مسلموں پر فوج کشی نہیں کی۔ جب ہندوستانیوں نے دیکھا کہ یہ پرتگیز کس طرح تلوار کے زور سے بیچارے گوا بندر والوں کو عیسائی بنا رہے ہیں

تو وہ ان کے خلاف ہو گئے اور پرتگیز اپنی قلمرو کے حدود نہیں بڑھا سکے۔ ان کے بعد ولندیزیوں نے آکر پرتگیزوں کو بہت سے مقامات سے نکال باہر کیا اور ان سے لنکا کا جزیرہ لے لیا۔ ولندیزیوں کے دیکھا دیکھی سنہ ۱۶۰۰ء میں (جب دہلی میں اکبر اعظم اور گولکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ حکومت کر رہے تھے) انگلستان کی ملکہ ایلزبتھ کے عہد میں چند انگریزوں نے ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کے لئے ایک شرکت قائم کی جس کا نام انھوں نے "انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی" رکھا اور اس نے اپنی سب سے پہلی تجارتی کوٹھی سورت میں بنائی جو اس زمانے میں ہندوستان کے مغربی ساحل کی سب سے بڑی بندرگاہ تھی۔ چند ہی سال بعد انھوں نے محمد قطب شاہ کے صوبہ دار کی اجازت سے چینا پٹن میں کچھ زمین خریدی اور یہاں ایک کوٹھی بنائی جس کے چاروں طرف بعد میں چل کر مدراس کا شہر آباد ہوا اور اس کے چند سال بعد پرتگیزوں نے اپنی ایک شاہزادی کے جہیز میں بمبئی کا جزیرہ بھی انگریزوں کے حوالہ کر دیا۔ ادھر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی سلطنت کے آخری زمانے میں انگریزی سوداگروں کو کالی گھاٹ کے قریب ایک کوٹھی بنانے کی اجازت دے دی اور اس طرح کلکتہ کی بنیاد رکھی گئی۔

۶۔ انگریزوں کے بعد ہی فرانسیسیوں نے بھی بظاہر ہندوستان سے تجارت کی غرض سے ایک شرکت قائم کی اور انھوں نے پونڈی چری اور چندر نگر

(بنگالہ) میں تجارتی کوٹھیاں بنائیں۔ حضرت آصف جاہ کے
انتقال سے چھ برس پہلے فرانسیسی کوٹھیوں کا گورنر ایک شخص
ڈیوپلے مقرر ہوا۔ یہ ڈیوپلے نہایت ذہین اور عقلمند شخص تھا اور اس
نے آتے ہی یہ بھانپ لیا کہ سلطنت مغلیہ کے دن گنے ہوئے ہیں اور
اب اس کا موقعہ ہے کہ ہندوستان میں فرانسیسی سلطنت قائم کی جائے۔
حسنِ اتفاق سے ان ہی دنوں میں براعظم یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں
میں لڑائی ٹھن گئی اور ڈیوپلے کو موقعہ ملا کہ کم سے کم انگریزوں کی
طاقت توتوڑ دے۔ جب نواب آصف جاہ ارکاٹ آئے اور انھوں نے
مدراس کے انگریز ایلچیوں کو شرف باریابی بخش کر نہ صرف ان کے
تحائف قبول کئے بلکہ ان میں سے چنی چنی چیزیں اپنے شہنشاہ
محمد شاہ بادشاہ کے حضور میں گزارنے کے لئے بھی دہلی روانہ کیں
تو اس روز سے مدراس کے انگریز اپنے آپ کو دولت آصف جاہی
کے گویا زیر حمایت سمجھنے لگے اور انھوں نے دربار آصفی میں استدعا
کی کہ خدارا انہیں فرانسیسی حملوں سے بچا لیجئے۔ لیکن ڈیوپلے
نے ایک اور تدبیر کی تھی وہ یہ کہ اس نے بہت سے ہندوستانی سپاہیوں
کو یوروپی وردیاں پہنا کر فرانسیسی طرز پر قواعد سکھائی تھی اور اس
طرح ہندوستانی فن حرب میں ایک نئے باب کا آغاز کیا تھا۔
اس زمانے کے ہندوستانی (آج کل کے ہندوستانیوں کے برخلاف)
نہایت بہادر اور ہمت والے تھے اور جب انہیں قواعد دانی کے بعد

باضابطہ منظم کیا گیا تو ان سے بہتر سپاہی ملنا دشوار ہو گیا، چنانچہ ان کی مدد سے فرانسیسیوں نے بہت سے معرکے جیتے اور نواب ارکاٹ اور انگریزوں کے متفقہ فوج کو کئی دفعہ نیچا دکھا کر خاص مدراس پر قبضہ کر لیا۔

۷۔ جب جنوب میں یہ واقعات ہو رہے تھے تو شمال میں احمد شاہ ابدالی والیٔ افغانستان نے دہلی کی زبوں حالات کو سن کر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ حضرت آصف جاہ یہ دیکھ کر کہ سلطنت ہند پر تباہی آنے کو ہے با وجود اپنے بڑھاپے کے فوراً اپنے مستقر اورنگ آباد سے شمال کی طرف چل پڑے۔ لیکن برہان پور پہونچنے پر ان کا مزاج ناساز ہو گیا اور آخر کار وہیں ملک عدم کو سدھارے۔ دیکھو اس عالی دماغ کی ہمت اور جرأت کہ آخر وقت تک اسے اپنے ملک اور اپنے شہنشاہ کا خیال رہا اور مرتے مر گیا لیکن اپنے فرض کی ادائگی سے منہ نہیں موڑا۔ ان کی وفاداری کا یہ حال ہے کہ جب سے بادشاہ نے خاص طور پر انہیں ہاتھی کی زرد عماری عطا کی تھی اس وقت سے وہ زردی کو پسند فرمانے لگے، چنانچہ اس روز سے آج تک اس ریاست ابد مدت کا رنگ زرد چلا آتا ہے۔ برہان پور سے ان کی لاش کو اورنگ آباد لائے اور شہنشاہ عالمگیر کے قبر کے قریب دفن کیا۔

باب ۱۳

نواب ناصر جنگ ۔ نواب مظفر جنگ ۔ نواب صلابت جنگ

(۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۱ء) (۱۷۵۱ء) (۱۷۵۱ء تا ۱۷۶۱ء)

۱۔ حضرت آصف جاہ اوّل نے کئی بیٹے چھوڑے جن میں سے سب سے بڑے کا نام امیر الامرا غازی الدین خاں تھا لیکن چونکہ یہ احمد شاہ بادشاہ دہلی کے وزیر اعظم تھے اس لئے اُن کی بجائے ان کے بھائی نواب میر احمد خاں ناصر جنگ اپنے والد کے بعد گدّی پر بیٹھے۔ ان کے علاوہ اس گدّی کے ایک اور دعوی دار بھی تھے۔ وہ ان کے بھانجے نواب میر ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ تھے اور انھوں نے یہ مشہور کیا تھا کہ حضرت آصف جاہ نے ان کے حق میں وصیت کی ہے۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان لڑائی تو جاری تھی، چنانچہ فرانسیسیوں نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کا ساتھ دیا اور انگریز نواب ناصر جنگ اور نواب انور الدین خاں کے ساتھ ہو گئے۔ اصل میں یہ پہلا موقعہ ہے کہ کسی یورپی طاقت نے ایک ہندوستانی امیر کے خلاف دوسرے کا ساتھ دیا ہے اور چونکہ جیسا جیسا

زمانہ گزرتا گیا ویسے ویسے ہندوستانیوں کے آپس کے لڑائی جھگڑے بڑھتے گئے اس لیئے ایک طرف انگریز اور دوسرے جانب فرانسیسیوں کا اقتدار روز بروز ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ ایک نے دوسرے کو نیچا دکھایا اور جب کوئی مد مقابل نہ رہا تو تمام ملک ہند کے مالک بن بیٹھے۔

۲۔ انورالدین خاں اور فرانسیسیوں، مظفر جنگ اور چنداصاحب کے مابین جو لڑائی ہوئی اس میں انورالدین خاں مارا گیا اور مظفر جنگ نے فاتحانہ حیثیت سے ارکاٹ آکر اپنی نظامت دکن کا اعلان کرکے چنداصاحب کو نواب کرناٹک بنادیا۔ اس کے بعد دونوں مظفر و منصور پونڈی چری گئے اور وہاں ہفتوں ڈیوپلے کے مہمان رہ کر خوب رنگ رلیاں کیں۔ ادھر انگریزوں سے بھلا یہ کب دیکھا جاتا تھا، چنانچہ انھوں نے فوراً انورالدین خاں کے بیٹے نواب والاجاہ محمد علی خاں کو نواب کرناٹک نامزد کیا اور نواب ناصر جنگ بہادر تمام صوبہ دکن سے (جس میں مہاراشٹر شامل تھا) ایک عظیم الشان فوج لے کر مظفر جنگ کے خلاف چلے۔ جب ڈیوپلے نے دیکھا کہ شکار ہاتھ سے نکلا جاتا ہے تو کمال تدبّر سے اس نے ناصر جنگ کے پاس اپنے سفیر روانہ کیے جن کا ظاہری مقصد تو یہ تھا کہ صلح کے لئے اپنی آمادگی کا اظہار کریں لیکن خفیہ طور پر انہیں ہدایت تھی کہ کسی طرح ناصر جنگ کا کام تمام کرنے کے لیے تیاری کریں۔ اسی دوران میں

نواب ناصر جنگ کو خبر ملی کہ فرانسیسی جرنیل بوسی کے مٹھی بھر
فوج نے جنجی جیسے زبردست قلعہ کو لے لیا ہے، اور وہ اس طرف
بڑھے۔ ڈیوپلے نہایت مکر وفریب سے تین چالیں چل رہا تھا۔
ایک طرف تو وہ ناصر جنگ بہادر سے اپنے سفیروں کے ذریعہ سے
نامہ و پیام کر رہا تھا، دوسری طرف ان ہی سفیروں کے وساطت
سے امراء کی ایک جماعت ناصر جنگ کے خلاف تیار کر رہا تھا اور
تیسری جانب جنجی کے فرانسیسی سپاہ کو احکام صادر کر رہا تھا کہ دکھنی
فوج پر حملہ کردیں۔ الغرض جب فریقین میں مڈبھیڑ ہوئی تو ناصر جنگ
یہ دیکھ کر کہ ان کی فوج کا ایک حصہ لڑائی میں مطلق حصہ نہیں لیتا،
نہایت متعجب ہوئے اور وہ چاروں طرف دیکھنے کے لئے اپنے
ہاتھی کے عماری پر ذرا اٹھے ہی تھے کہ خود ان کے باغی امراء میں سے
ایک نے انھیں اپنی گولی کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔

۳۔ ناصر جنگ کے قتل کے بعد ہی فرانسیسیوں نے فوراً
نواب میر ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ کی نظامت دکن کا اعلان
کردیا۔ مظفر جنگ یہاں سے پونڈی چری گئے جہاں ڈیوپلے اور چند اصحاب
نے نہایت کروفر سے ان کا استقبال کیا اور عیش و عشرت کے بازار خوب
گرم ہوئے۔ فرانسیسیوں کا اثر اتنا بڑھ گیا تھا کہ مظفر جنگ اپنے
مستقر اورنگ آباد نہیں بلکہ پونڈی چری میں گدی پر بیٹھے
اور انھوں نے فوراً ڈیوپلے کو دریائے کرشنا کے جنوب کی طرف کا نواب

بنا کر حکم دیا کہ جو کچھ کارروائی ہمارے ساتھ ہو
وہ سب دیوپلے کی وساطت سے ہو اور اس طرح گو چندا صاحب
کو نواب کرناٹک مقرر کیا گیا لیکن اسے دیوپلے کے ماتحت رہنے
کا حکم دیا گیا۔ نیز دیوپلے نے مظفر جنگ کے ذاتی حرس کے طور پر ایک
فرانسیسی دستے کے ساتھ بوسی کو حیدرآباد کی طرف روانہ کیا۔ مگر
مظفر جنگ کے قسمت میں زیادہ دن تک نظام دکن بننا نہیں لکھا تھا
اس لئے کہ جب وہ پونڈی چری سے واپس آ رہے تھے تو راستے میں
کسی بات پر نواب کڑپہ سے مقابلہ ہوا اور عین لڑائی کے وقت خود
اس کے ہاتھوں وہ مارے گئے۔

۴۔ بوسی نے کمال دانشمندی سے مظفر جنگ کے کمسن
بیٹے کی جگہ نواب آصف جاہ کے تیسرے فرزند نواب امیر الممالک
میر محمد خاں صلابت جنگ کی نظامت دکن کا اعلان کر دیا اور انھوں نے
ان تمام مراعات کی تصدیق کر دی جو ان کے مقتول بھتیجے
مظفر جنگ نے فرانسیسیوں کے ساتھ کی تھیں اور ان کی مسند نشینی
کے بعد احمد شاہ بادشاہ ہند نے بھی ان انتظامات کی توثیق کر دی
جو مظفر جنگ کے زمانہ میں عمل میں آئے تھے۔ اب دکن اور کرناٹک
کے درمیان روز بروز اختلاف بڑھتا جاتا تھا اس لئے کہ کرناٹک میں
نواب محمد علی خاں والا جاہ کا رسوخ تھا اور وہ انگریزوں کے طرفدار
تھے اور ادھر دکن میں فرانسیسی حاوی تھے اور ان ہی کا مسودہ میں

بھی زور تھا۔ مظفر جنگ کے بڑے بھائی یعنی حضرت آصف جاہ اول کے بڑے فرزند نواب غازی الدین خاں اب تک تو دہلی کے وزیر اعظم تھے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دہلی میں کچھ نہیں رہا تو انھوں نے دکن کا رُخ کیا اور بادشاہ سے صوبہ داری دکن کی سند لے کر دکن کی طرف آئے اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ لے کر دکن پر چڑھائی کی۔ لیکن صلابت جنگ کے فرانسیسی سپہ سالار بوسی نے (جسے اب سیف الدولہ عمدۃ الملک کا خطاب مل چکا تھا) کمال عقلمندی اور ترکیب سے مرہٹوں کے ملک پر حملہ کر کے انہیں علیحدہ کر دیا، چنانچہ اب نواب غازی الدین خاں تنہا رہ گئے اور آخر کار چند روز بعد اورنگ آباد میں انتقال کیا۔

۵۔ لیکن رفتہ رفتہ فرانسیسیوں کا اثر گھٹتا جاتا تھا۔ انگریزی افسر کلائیو نے ارکاٹ کو محمد علی خاں والاجاہ کے لئے فتح کر لیا تھا اور نواب حسین دوست خاں چندا صاحب اور اس کے فرانسیسی مشیروں کو وہاں ناکامی پر ناکامی ہوئی تھی۔ پھر خود ملک فرانس میں ایک فریق ایسا پیدا ہو گیا تھا جو دیوپلے کے کامیابیوں سے حسد رکھتا تھا اور اسے نیچا دکھانے کی فکر میں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ صلابت جنگ کے دربار میں بھی بوسی کا بہت بڑا رسوخ تھا اور جب وہ چند روز کے لئے اپنی جاگیر مچھلی بندر کو چلا گیا تو اس کے پیچھے فرانسیسی فوج کی تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے سخت بدانتظامی پھیل گئی چنانچہ بوسی واپس آیا اور

نواب صلابت جنگ سے کہا کہ جب تک آپ اس کی تنخواہ کے لئے اپنے ملک کا کوئی مستقل علاقہ میرے سپرد نہ کردیں گے اس وقت تک میں کسی طرح سے انتظام نہیں کرسکتا۔ چنانچہ صلابت جنگ نے مچھلی بندر کے شمال اور جنوب کے تمام سرکاریں جنہیں اصطلاح میں "شمالی سرکاریں" کہتے ہیں" اس فوج کے تنخواہ کے اخراجات کے لئے بوسی کے سپرد کردیں۔ یہ غالباً پہلا موقع ہے کہ سینکڑوں میل کا کوئی رقبہ کسی یوروپی کے حوالہ کردیا گیا ہو ورنہ اس وقت تک تو انگریز اور فرانسیسی دونوں کی تجارتی کوٹھیاں ہی کوٹھیاں تھیں اور انہیں ان پر قانع رہنا پڑتا تھا۔

۱۴ ۔ بہرحال چونکہ یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان جو جنگ ہوئی تھی وہ ختم ہوگئی اس لئے بظاہر ہندوستان میں بھی ان کی باضابطہ جنگ کا خاتمہ ہوگیا گو دونوں فریق ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آئے۔ اس صلح سے صلابت جنگ کو ایک طرح سے فائدہ ہوا اس لئے کہ جب انھوں نے دیکھا کہ میدان خالی ہے تو فوراً میسور کی طرف چلے اور وہاں کے راجہ سے بقایا پیش کش وصول کرکے واپس اورنگ آباد آگئے۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ صلابت جنگ کا اثر جنوبی و مشرقی ہند سے روز بروز گھٹتا جاتا تھا اور میسور میں ایک شخص حیدر علی خاں اکرآباد ہوگیا تھا جو اپنی قابلیت کی وجہ سے روز بروز ترقی کرتا جارہا

تھا اور حکومت میسور کو بیرونی دباؤ سے آزاد کرکے اپنے قبضہ میں
لیتا جا رہا تھا۔ پھر مشکل یہ آپڑی تھی کہ سالہا سال سے فرانسیسی
فوج کی موجودگی کی وجہ سے صلابت جنگ بالکل اسی پر تکیہ
کرنے لگے تھے، اور جب انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف خود میرے
دربار میں میری مخالفت بڑھ رہی ہے اور دوسرے جانب فرانسیسی
بھی جا رہے ہیں تو وہ بڑے فکرمند ہوئے اور بیوسی سے کہا کہ صلح
وغیرہ میں کچھ نہیں جانتا اگر تم میرا ساتھ چھوڑتے ہو تو پھر میں انگریزوں
سے میل کئے لیتا ہوں۔ یہ سب ہو ہی رہا تھا کہ انگریزوں اور
فرانسیسیوں کی جنگ دوبارہ چھڑ گئی اور دیوپلے کی جگہ پونڈی چری
میں فرانسیسیوں کی طرف سے لالی گورنر مقرر ہوا۔ ادھر ۱۷۵۷ء
میں کلائیو نے پلاسی کے مقام پر شاہ عالم بادشاہ کے صوبہ دار
بنگالہ سراج الدولہ کو شکست فاش دے دی تھی اور فرانسیسی
نوآبادی چندر نگر پر قبضہ کر لیا تھا۔ لالی نے فوراً بیوسی کو لکھا کہ
تم مچھلی بندر آکر مجھ سے ملو تا کہ ہم سب یکجا ہو کر مدراس پر چڑھائی
کریں اور انگریزوں کو نیچا دکھائیں۔ جب انگریزوں نے فرانسیسیوں
کو زکوں پر زکیں دیں تو خود صلابت جنگ بھی ان کی مدد کو گئے،
لیکن اس سے کچھ نہیں نکلا اور مچھلی بندر پر انگریزوں کا قبضہ
ہو گیا۔

۷۔ لیکن شاید اس سے بھی زیادہ جو نقصان سرکار نظام کو

اُٹھانا پڑا وہ مرہٹوں کے ہاتھ سے تھا۔ اول تو مرہٹوں نے قلعہ دار کو رشوت دے کر احمد نگر پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد جب انھوں نے دیکھا کہ خانوادۂ آصفیہ کے ارکان میں آپس میں نفاق پیدا ہو گیا ہے اور کمزوری اپنی حد کو پہنچ گئی ہے تو انھوں نے اس قلمرو کے قلب پر حملہ کر دیا اور دکھنی فوجوں کو اودگیر کے مقام پر سخت شکست دے کر سرکار نظام کو مجبور کیا کہ برہان پور تمام صوبہ اورنگ آباد (علاوہ شہر اورنگ آباد) بیدر و بیجا پور کے تمام مغربی علاقوں پر سے اپنا قبضہ اُٹھا لیں اور مرہٹوں کو باقی ماندہ علاقہ جات دکن پر چوتھ وصول کرنے کا اختیار بھی دے دیں۔

۸۔ اُدھر ایک طرف تو انگریز میدان جنگ میں فرانسیسیوں کو نیچا دکھا رہے تھے، دوسری جانب دربار دکن کی کمزوری کا صحیح اندازہ کر کے وہ مختلف ترکیبوں سے خود صلابت جنگ کو اپنے ساتھ مخالفہ کرنے پر آمادہ کر رہے تھے، چنانچہ آخر کار صلابت جنگ نے بجائے فرانسیسیوں کے انگریزوں کے ساتھ اتحاد کر لیا، جس کے بموجب انھوں نے مچھلی بندر اور نظام پٹم کی سرکاریں بالکلیہ انگریزوں کے حوالہ کر دیں اور وہ سب حقوق جو پہلے فرانسیسیوں کو حاصل تھے ان کی طرف منتقل کر دئے۔ ساتھ ہی انھوں نے یہ وعدہ کیا کہ آیندہ وہ

دریائے کرشنا کے شمال میں کبھی کسی فرانسیسی کے سپرد کوئی خدمت نہ کریں گے۔ اُدھر دربار میں ایک فریق ایسا پیدا ہو گیا تھا جو صلابت جنگ کا مخالف اور اُن کے بھائی میر نظام علی خاں بہادر کا طرفدار تھا، چنانچہ حالات سے متاثر ہو کر صلابت جنگ نے اُنھیں اپنا وزیر اعظم بنا لیا۔ کچھ ہی زمانہ گزرا تھا کہ امرائے اعیان حکومت نے نظام علی خاں بہادر سے استدعا کی کہ ملک کا کام اُس وقت تک درست نہیں ہو سکے گا جب تک سرکار خود مسند نشین نہ ہو جائیں، اور صلابت جنگ کو معزول کر کے اُنھیں گدی پر بٹھا دیا۔

باب ۱۴

آصف جاہ ثانی نواب میر نظام علی خاں بہادر

(۱۷۶۱ء تا ۱۸۰۳ء)

نواب آصف جاہ ثانی اپنی مسند نشینی سے پہلے ہی اپنے بھائی نواب صلابت جنگ کے عہد میں وزیر رہ چکے تھے جس کی وجہ سے انہیں پوری طور سے حکومت کا تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ تخت پر بیٹھے ہی تھے کہ پونڈی چری پر انگریزی قبضہ ہو جانے کی وجہ دکن میں سے فرانسیسی اثر کا تقریباً خاتمہ ہو گیا اور دو تین سال بعد جب ۱۷۶۴ء میں بکسر کے جنگ کے بعد انگریزی کمپنی کو شاہ عالم ثانی بادشاہ دہلی کی طرف سے بنگالہ، بہار، اور اڑیسہ کے دیوانی کے اختیارات حاصل ہو گئے تو ہندوستان میں ان کا اثر بہت کچھ بڑھ گیا۔ انگریزوں نے یہ ہوشیاری کی کہ اس کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے بادشاہ سے کرناٹک کے شمالی سرکاروں کے (جو اس وقت تک صوبہ دکن کے ماتحت تھے) دیوانی کے اختیارات بھی حاصل کر لئے اور ظاہر ہے کہ نواب آصف جاہ ثانی کو یہ بہت ہی برا معلوم ہوا کہ ان کے

صوبہ کا ایک حصہ اس طرح سے انگریز بالا بالا اپنے قبضہ میں لے لیں
انگریز اس وقت لڑنا بھی نہیں چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے ایک
سفارت دربار دکن کو روانہ کی۔ نواب آصف جاہ ثانی اور اس سفارت
کے درمیان اب یہ معاہدہ ہوا کہ شمالی سرکاریں نو لاکھ سالانہ پیش کش کے
معاوضہ میں انگریزوں کو دے دی جائیں، اور جب کبھی دربار حیدرآباد
کو ضرورت ہو انگریز ان کی فوجی مدد کریں۔ ساتھ ہی نواب آصف جاہ
نے وعدہ کیا کہ اسی طرح جب کبھی انگریزوں کو ان کی مدد کی ضرورت
ہوگی تو وہ بھی خوشی سے ان کی مدد کریں گے۔

۲ — یہ عہدنامہ اس لئے اہم ہے کہ علاوہ بیچ میں چند روز کے
جب نواب آصف جاہ نے نواب حیدر علی خاں والی میسور کے ساتھ
کرناٹک اور انگریزوں کے مخالفت میں اتحاد کر لیا تھا اس وقت
سے آج تک مسند نشین حیدرآباد اور انگریزوں کے مابین ہمیشہ
امن رہی ہے۔ جب نواب آصف جاہ نے دیکھا کہ حیدر علی خاں
کے ساتھ مل جانے سے میرا نقصان ہی نقصان ہے تو انھوں نے
چارو ناچار محمد علی خاں والا جاہ کو کرناٹک کا نواب تسلیم کر لیا، لیکن
ساتھ ہی انگریزوں کی طرح والا جاہ نے بھی حیدرآباد کے ساتھ یہ
معاہدہ کیا کہ جب کبھی ضرورت ہوگی تو یہ دونوں اعلیٰ حضرت کو مدد
دیں گے۔ اس عہدنامے کے بعد کرناٹک سے آصف جاہ ثانی کا
اثر اٹھ گیا اور یہ حصہ انگریزوں کے ماتحتی میں آگیا۔ نیز اب تک تو یہ

ہوتا تھا کہ جب کبھی انگریزوں کو اعلیٰ حضرت کے ساتھ کوئی بات کرنی ہوتی تھی تو وہ خاص طور پر کوئی سفارت دکن روانہ کرتے تھے، اور جب کبھی اعلیٰ حضرت کو کوئی معاملہ کرنا ہوتا تھا تو اسی طرح سے وہ اپنا سفیر انگریزوں کے مستقر کلکتہ بھیجتے تھے لیکن اب سے انگریزوں نے ایک مستقل سفیر جسے "ریزیڈنٹ" کہتے ہیں دکن کے دارالحکومت حیدرآباد میں رکھنا شروع کیا، اور رفتہ رفتہ یہ قرار پا گیا کہ یہ شخص نہ صرف انگریزوں کے پیغامات سرکار نظام تک پہنچائے گا بلکہ سرکار نظام کے مقاصد بھی انگریزوں کے کان میں ڈالتا رہے گا اور سرکار نظام کلکتہ سے اپنا سفیر ہٹا لیں گے۔

۳۔ میسور میں نواب حیدر علی خاں کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا نواب فتح علی خاں عرف ٹیپو سلطان سربراہِ حکومت ہوا اور اس نے فوراً اپنے ملک کے حدود کو بڑھانے کی تدبیریں اختیار کرنی شروع کیں۔ یوں تو حیدر علی خاں کو بھی انگریزوں کے خلاف متعدد مقامات پر کامیابیاں ہو چکی تھیں لیکن ٹیپو کی بہادری اور حُبِ وطن بے مثل تھا، اور جب اس نے ایک طرف بیجاپور پر اور دوسری جانب انگریزی کے حلیف راجہ ٹراونکور کے خلاف چھاپے مارنے شروع کئے تو عہد نامے کے موافق انگریزوں نے نواب آصف جاہ اور مرہٹوں سے فوجی کمک کی استدعا کی اور ان تینوں کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا جسے "محالفۂ ثلاثہ" کہتے ہیں۔ حیدرآبادی افواج کی کمان

اعلیٰ حضرت کے فرزند نواب سکندر جاہ بہادر اور ان کے وزیر میر عالم
کے سپرد تھی۔ لڑائی میں افواج آصفیہ کو کامیابی ہوئی اور نواب
آصف جاہ بہادر کو منجملہ دوسرے علاقوں کے رائچور کا دوآبہ، کڑپہ اور
کرنول مل گئے جن پر حیدر علی خاں نے قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن کامیابی
کے چند ہی روز بعد جب سرکار نظام پر وقت پڑا اور انھوں نے انگریزوں
سے مدد کا مطالبہ کیا تو نئے انگریزی گورنر جنرل سر جان شور نے "عدم
مداخلت" کے اصول کے مطابق کمال بے پروائی کے ساتھ اس مطالبے
کو رد کر دیا اور نواب آصف جاہ کو تنہا چھوڑ دیا۔ قصہ یہ تھا کہ مرہٹوں
اور دربار حیدرآباد کے درمیان ہمیشہ سے سخت رقابت چلی آتی تھی اور
جب موقعہ ملتا تو مرہٹوں کا پیشوا صوبۂ دکن سے چوتھ اور سردیش مکھی
کا مطالبہ کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ مرہٹوں
کی باہمی رقابتوں میں نواب آصف جاہ کو ایک فریق کا ساتھ دینا پڑا۔
چنانچہ ۱۷۷۵ء میں انھوں نے ایک دعویدار پیشوائی رگھوناتھ راؤ
کے خلاف مدد کی جس کے صلے میں انہیں دولت آباد اور جالنہ
واپس مل گیا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس زمانے میں مرہٹوں
کا پیشوا مادھوراؤ نرائن اور اس کا وزیر ایک نہایت باتدبیر مرہٹہ
نانا فرنویس تھا۔ اس نے شاید یہ سوچ کر کہ ابھی ٹیپو سے لڑائی
ہو چکی ہے اب حیدرآباد کیا لڑے گا، اپنے سفیر کو حیدرآباد بھیجا کہ بقایا
چوتھ کا مطالبہ کرے۔ سرکار آصفیہ کو اپنی قوت پر ہی نہیں بلکہ انگریزوں

کی مدد پر بھی ایک طرح کا گھمنڈ تھا، چنانچہ مرہٹہ سفیر کو اپنا منھ لے کر واپس جانا پڑا۔ اب سرکار نظام نے انگریزوں سے مدد کا مطالبہ کیا اور کہا کہ جیسے ہم نے تمھیں میسور کے خلاف مدد دی ویسے ہی اب تم مرہٹوں کے خلاف مدد دو، لیکن کلکتہ سے انکاری جواب ملا۔ نانا فرنویس نے تمام مرہٹہ سرداروں سے فوجیں طلب کیں اور حیدرآبادی فوج کا ایک لاکھ کی بہادر سپاہ سے مقابلہ کیا نتیجہ وہی ہوا جو ہوتا تھا، یعنی کھرڈلا کے مقام پر آصف جاہ ثانی نے ہتھیار ڈال دیئے اور جو ان سے کہا گیا اسے مجبوراً منظور کرنا پڑا یعنی دولت آباد جالنہ، بیڑ، اندور، ناندیڑ، بیدر کے وسیع علاقے اور ایک عظیم الشان خرچہ جنگ پیشوا کے حوالہ کرنا پڑا۔

۴۔ اس شکست سے آصف جاہ ثانی انگریزوں سے ناراض ہو گئے اور انگریز رزیڈنٹ سے کہلوا بھیجا کہ آپ نے جو دو پلٹنیں حیدرآباد میں میری مدد کے لیے چھوڑی ہیں۔ مجھے اب ان کی ضرورت نہیں ہے، آپ انھیں شوق سے ہٹوا دیجئے۔ اس زمانے میں ہندوستان کے تقریباً ہر ایک دربار میں یورپ کے مختلف ملکوں کے باشندے ملازم تھے، اور گو سرکاری طور پر فرانسیسی گر گئے تھے لیکن بہت سے درباروں میں فرانسیسی مدبروں اور سپاہیوں کا بڑا رسوخ تھا۔ حیدرآباد میں بھی اس زمانے میں ایک فرانسیسی موسیو ریموں کا جسے بعض کتابوں میں موسی رحمو لکھا ہے اور جس کے نام پر شاید بیسرم

کا رسالہ موسوم ہے) ستارہ اقبال پر تھا، اور نواب آصف جاہ ثانی نے انگریزوں سے مایوس ہو کر اپنی فوج کی تنظیم اس کے سپرد کر کے اپنی قلمرو کا ایک علاقہ اس کے اخراجات کے لئے گویا وقف کر دیا تھا۔ ریموں کا رسوخ اتنا بڑھا کہ ملک میں کہیں بغاوت برپا ہوتی تو اسی کے رسالے کو بھیجا جاتا، اور باوجود انگریز ریزیڈنٹ کے اعتراضوں کے اسے برطرف نہیں کیا جاتا۔ ریموں کے موت تک صورت حال اسی قسم کی رہی لیکن اس کے بعد جو شخص اس کی جگہ مقرر ہوا اس میں وہ بات نہیں تھی، اور ادہر شور کے بعد ویلزلی نے گورنر جنرل مقرر ہوتے ہی یہ طے کر لیا کہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، ہندوستانی ریاستوں کو اپنے قابو میں لے آوٗں گا اور انھیں سمندر کے ساحل سے ہٹا دوں گا تاکہ انگریز ہر جگہ حاوی ہو جائیں۔

اس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ ٹیپو سلطان جو ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا اور جس نے مدراس تک کے تقریباً تمام ملک پر قبضہ کر لیا تھا، کسی طرح سے نیست و نابود ہو جائے تاکہ انگریزوں کے دم میں دم آئے۔ الغرض اس نے ہندوستان آتے ہی ایک نہایت ہوشیار اور زمانہ دیدہ شخص کرک پیٹرک کو ریزیڈنٹ بنا کر بھیجا جس نے دھمکی دے کر نہیں، بلکہ تعلقات بڑھا کر، نواب آصف جاہ کا دل ایسا موہ لیا کہ سرکار اسے دل سے چاہنے لگے اور اسے نواب حشمت جنگ بہادر کا خطاب دیا۔ بہرحال

سنہ ۱۷۹۸ء میں انگریزوں کی ترکیبیں چل گئیں اور نواب آصف جاہ نے ایک عہد نامے پر دستخط کر دیئے جس کی وجہ سے حکومت دکن سے رہا سہا فرانسیسی اثر زائل ہو گیا۔ اس عہد نامے کی رو سے قرار پایا کہ فرانسیسی پلٹنیں برخاست کر دی جائے گی اور انگریزی پلٹنوں کی تعداد بڑھا دی جائے گی؛ ساتھ ہی انگریز سرکار نظام کی ہر طرح مدد کریں گے اور مرہٹوں سے لڑائی ہوئی تو اس میں حیدرآباد کا ساتھ دیں گے۔

۵ — الغرض جب گورنر جنرل کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ سرکار نظام ہمارے ساتھ ہیں گے تو پھر انھوں نے میسور کے خلاف فوج کشی شروع کی اور اعلیٰحضرت کے ساتھ مرہٹوں سے مدد کے لئے کہا۔ مرہٹوں نے تو مدد نہیں بھیجی لیکن حیدرآباد کی فوج میر عالم کی سرکردگی میں انگریزوں کے مدد کے لئے میسور پہنچی اور ایک ہی وار میں ٹیپو کا صدر مقام سرنگاپٹم فتح کر لیا۔ اس معرکہ میں جو میسور اور انگریزوں کے درمیان ہوا تھا بہادر ٹیپو لڑتا لڑتا شہید ہوا اور ہندوستان کی تاریخ پر ہمیشہ کے لئے اپنا نشان چھوڑ گیا۔ اس مہم کے بعد سنہ ۱۸۰۰ء میں میسور کے حصے بخرے کرنے کے لئے انگریزوں اور سرکار نظام کے درمیان صلح نامہ سرنگاپٹم پر دستخط ہوئے جس کے بموجب کڑپہ، کرنول، بلاری اور اننتاپور (جنھیں ٹیپو نے دوبارہ فتح

کر لیا تھا) برائے نام سرکار حیدرآباد کو ملے لیکن انگریزی فوج کی تنخواہ کی ادائیگی کے ان پر قبضہ انگریزوں ہی کا رہا۔ یہ بھی قرار پایا کہ حیدرآباد میں انگریزی فوج بڑھا دی جائے گی اور سرکار نظام بغیر انگریزوں کی منظوری کے کسی دوسری ریاست کے ساتھ نہ جنگ کریں گے نہ گفت وشنید کریں گے۔

۲۔ انگریزوں کے لئے اب دکن میں تو مطلق کسی قسم کا خطرہ نہیں رہا تھا، لیکن شمالی اور مغربی ہندوستان میں مرہٹوں کا ضرور ڈر تھا اس لئے کہ وہ میسور کی سرحد سے لے کر دہلی اور آگرے تک تمام ملک پر پوری طرح سے حاوی تھے، اور انھی میں سے ایک سردار یعنی سیندھیا نے تو خاص دہلی پر قابض ہو کر اپنے آپ کو بے چارے نابینا بادشاہ دہلی یعنی شاہ عالم ثانی کا نائب بنا لیا تھا۔ انگریزوں کو ایک فائدہ ضرور تھا وہ یہ کہ مرہٹہ سرداروں یعنی سیندھیا اور ہولکر کے درمیان خانہ جنگی برپا رہتی تھی، اور یہ قاعدہ ہے کہ دو میں لڑائی ہو تو تیسرے کا ضرور فائدہ ہوتا ہے۔

تمام مرہٹہ سرداروں میں سب سے کمزور اس وقت ان سب کا پیشوا باجی راؤ دوم تھا جس نے اس وقت تک تو انگریزوں کے ساتھ کسی ایسے عہد نامہ پر دستخط کرنے سے انکار کیا تھا جس سے اس کے اقتدار میں کمی پیدا ہوئی ہو، لیکن اب جب میسور کا گویا خاتمہ ہو چکا تھا اور نواب آصف جاہ دوم بے بس ہو گئے تھے،

اس نے بھی اسی طرح کے "عہد معاونت" پر دستخط کردیئے جیسا انگریزوں اور حیدرآباد کے درمیان ہوا تھا۔

۷۔ یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ فرانسیسیوں یا انگریزوں کا اثر قبول کرنے کی وجہ سے حیدرآباد نے شہنشاہ ہند سے خواہ وہ کتنا ہی بے بس کیوں نہ ہو منہ پھیر لیا ہوگا، بلکہ اس کے برعکس گو اب حیدرآباد پر دہلی کا کسی قسم کا اثر باقی نہیں رہا تھا پھر بھی یہاں برابر شاہ عالم ہی کا سکہ چلتا تھا اور خطبہ میں اسی کا نام لیا جاتا تھا۔ نواب آصف جاہ ثانی کے دل میں اس بادشاہ کی اتنی وقعت تھی کہ جب کبھی انگریزوں یا فرانسیسیوں کی وساطت سے یا براہ راست دہلی سے کوئی فرمان صادر ہوتا یا کوئی خطاب ملتا تو وہ اس کے لئے خاص طور پر دربار کرتے اور بڑی خوشیاں مناتے۔ کہتے ہیں کہ ٹیپو کے خاتمہ کے بعد جب انگریزی گورنر جنرل نے نواب آصف جاہ سے کہا کہ اب اگر آپ سلطان یا بادشاہ کا خطاب حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ جس وقت تک خاندان تیموریہ کا ایک شہزادہ بھی باقی ہے اس وقت تک والئی دکن کو بادشاہی کا خطاب اختیار کرنا نہایت ہی نامناسب ہوگا۔ تقریباً اسی زمانے میں اودھ کے نواب وزیر سے بھی انگریزوں نے یہی پوچھا تو اس نے شاہی خطاب منظور کرلیا، اور یہ خدا

کی قدرت اور خاندان آصفیہ کے نیک نیتی کی برکت ہے کہ
اودھ کی نام کی بادشاہت کا کہیں پتہ بھی نہیں لیکن
اللہ کے فضل سے حیدرآباد کی حقیقی بادشاہت آج تک
ترقی کا راستہ جلد جلد طے کر رہی ہے۔

باب ۱۵

نواب سکندر جاہ بہادر
(سنہ ۱۸۰۳ء تا سنہ ۱۸۲۹ء)

نواب ناصر الدولہ بہادر
(سنہ ۱۸۲۹ء تا سنہ ۱۸۵۷ء)

۱۔ نواب آصف جاہ ثانی کے انتقال کے بعد ان کے بڑے بیٹے نواب سکندر جاہ میر اکبر علی خاں بہادر مسند نشین ہوئے اور پہلے کی طرح شاہ عالم بادشاہ دہلی سے ان کی صوبہ داری کی منظوری کا فرمان صادر کیا۔ لکھا ہے کہ جب یہ فرمان شہر حیدرآباد کے نواح لنگم پلی کے قریب آیا تو نواب سکندر جاہ نے خود جا کر وہاں دربار کیا اور اس فرمان کا استقبال کر کے اسے اپنی دستار میں رکھا۔ نواب سکندر جاہ ابھی تخت پر بیٹھے بھی نہ تھے کہ مرہٹوں اور انگریزوں میں لڑائی ٹھن گئی۔ مرہٹہ سردار مثلاً سیندھیا اور ہولکر پیشوا کے عہد معاونت پر دستخط کرنے سے سخت ناراض تھے،

اور آسانی کے ساتھ اپنی عزیز آزادی عمل کو خیرباد نہیں کہنا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے ٹیپو کی طرح انگریزوں سے لڑنا ہی بہتر سمجھا۔ لیکن آخر کار جب جنگ علیگڈھ کے بعد دہلی آگرہ سیندھیا کے قبضے سے نکل گئے اور ڈیگ کے مقام پر ہولکر کو نیچا دیکھنا پڑا تو دونوں نے ہتیار ڈال دیئے اور شمال میں دریائے ستلج تک تمام ملک اور جنوب میں براڑ، احمد نگر، دولت آباد، اور جالنہ فاتحوں کے حوالے کرنا پڑا۔ چونکہ اس جنگ میں سرکار آصفیہ نے انگریزوں کی نہایت وقیع مدد کی تھی اس لئے براڑ، دولت آباد اور جالنہ واپس سرکار نظام کو مل گئے۔

۲۔ نواب سکندر جاہ بہادر نہایت نیک منش حکمراں تھے۔ شاید ان کے سیدھے پن کی وجہ سے انگریز نہ صرف فوجی معاملات میں بلکہ ملکی معاملات میں بھی پوری طور سے حاوی ہو گئے اور چونکہ نظمائے حکومت انگلستان کی طرف سے یہ ہدایت آگئی تھی کہ نواب سکندر جاہ معاملات حکومت میں کوئی حصہ نہ لیں اس لئے مدار المہام ریزیڈنٹ کے ہاتھ میں تقریباً کٹھ پتلی بن گئے۔ ان کی مسند نشینی کے بعد ہی میر عالم کے انتقال پر مدار المہام کے تقرر کا مسئلہ پیش ہوا تو ریزیڈنٹ نے براہ راست مداخلت کی، اور گو مدار المہام وہی امیر مقرر ہوا جسے اعلیحضرت چاہتے تھے لیکن دراصل تمام اختیارات پیشکار مہاراجہ چندو لال کے سپرد ہوئے

جن کی تائید رزیڈنٹ نے کی تھی۔ مہاراجہ چندولال کے تقرر کے بعد ہی ایک نیا مسئلہ چھڑا۔ اسی زمانے میں انگریزوں کو سب سے زیادہ مرہٹوں سے خطرہ لگا ہوا تھا اس لئے کہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ پیشوا ۱۸۰۰ء کے عہد معاونت سے خوش نہیں ہے اور کسی طرح سے اپنے آپ کو آزاد کرانا چاہتا ہے۔ انگریزوں کو سب سے زیادہ حیدرآباد کی اعانتی فوج پر بھروسہ تھا، لیکن اس فوج میں ترتیب و تنظیم کی بڑی کمی تھی۔ اب رزیڈنٹ رسل نے اس کی طرف توجہ کرکے اس کی حالت کو سدھارنے کی کوشش کی۔ لیکن مشکل یہ پڑی کہ بدانتظامیوں اور جاگیرداروں کے اختیارات کے بڑھ جانے کی وجہ سے خزانۂ عامرہ میں روپیہ نہیں رہا تھا، چنانچہ رسل نے مہاراجہ چندولال سے یہ طے کیا کہ اس میں کچھ ہرج نہیں، آپ ہماری سکندرآباد کی چھاونی سے سامان جنگ خرید یئے اور جو روپیہ ہوگا وہ شمالی سرکاروں کی پیش کشی میں سے مجرا ہوتا رہے گا۔ یہ تو ہوگیا، لیکن حیدرآباد کی اس "اعانتی فوج" کے اخراجات روز بروز بڑھتے گئے، یہاں تک کہ پیش کش کی رقم بھی اس کے لئے کم پڑنے لگی۔ یہ دیکھ کر رزیڈنٹ نے انگریزوں کے ایک ساہوکار سے پامر کمپنی کو اجازت دی کہ سرکار نظام کو فوج کے لئے جس رقم کی ضرورت ہو وہ سود پر مہیا کرے؛

مگر سرکار نظام کے پاس نہ اصل دینے کو روپیہ تھا اور نہ سُود ادا کرنے کو، جس کی وجہ سے قلمروئے سرکار عالی پر یہ بار برابر بڑھتا ہی گیا۔

۳۔ الغرض انگریزوں اور مرہٹوں سے ازسرنو لڑائی ٹھن گئی اور انگریزوں نے پونہ کے قریب کھڑکی کے مقام پر پیشوا کو شکست دے کر اس کا تمام ملک اس سے چھین لیا، ہولکر کو مہدپور پر شکست دے کر اُسے عہد معاونت قبول کرنے پر مجبور کیا اور سیتا بلدی پر مہاراجہ بھونسلے کو شکست دے کر برار کے ایک بڑے حصے سے اُسے بے دخل کر دیا۔ اس لڑائی میں حیدرآباد کی فوج نے بہت کچھ کارنامے کر کے دکھائے اور اس کی وجہ سے سرکار نظام پیشوا کو جو چوتھ دیتے تھے وہ بچ گئی اور مرہٹوں کا بہت کچھ علاقہ بھی ہاتھ آیا لیکن دوسری طرف جب رزیڈنٹ نے دیکھا کہ یہ پلٹن کس قدر کام آئی ہے تو اسے اس کے بڑھانے کا خیال ہو گیا، چنانچہ اس پر جو اخراجات تھے وہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئے، حالانکہ اب نہ ٹیپو کا ڈر باقی تھا، نہ مرہٹوں کا، نہ فرانسیسیوں کا۔ اُدھر پامر کمپنی کی موجودگی میں روپیہ قرض ملنے کی تو کمی نہ تھی، یہ دوسری بات ہے کہ قرض جیسی ناپاک چیز سے حیدرآباد کی بنیادیں ہل گئی ہوں۔

سولہ لاکھ دینے پڑے۔

۴۔ نئے رزیڈنٹ میٹکاف کے آنے پر حیدرآباد کے جان میں جان آئی اور اس نے آتے ہی یہ محسوس کیا کہ حیدرآبادی پلٹنیں یہاں کے خزانے پر بار عظیم ہیں، اور تاوقتیکہ ملک کا انتظام بہتر نہ ہو جائے یہ اس بوجھ کو اٹھا نہیں سکتا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ پامر کمپنی کا رسوخ خود رزیڈنٹ سے بھی زیادہ ہو گیا ہے اس لئے کہ بظاہر روپیہ کی تھلیاں اسی کمپنی کے قبضے میں ہیں اور فوج کے بہانے اسی کا پیٹ بھرتا جاتا ہے۔ الغرض سب سے پہلے اس نے ملک کے انتظام کی طرف اپنی توجہ کی۔ اضلاع میں روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے نہایت بدانتظامی تھی اور ہر علاقے کا ہرج ہوتا تھا جس کے بعد خریداروں کو مستقل رقم سالانہ دینی پڑتی تھی، لیکن نگرانی نہیں کی جاتی تھی کہ وہ رعایا سے کس قدر رقم وصول کرتے ہیں۔ امن و اماں بالکل غائب تھا اور راستہ چلنا تک دشوار ہو گیا تھا۔ اب رزیڈنٹ نے ہر ضلع میں ایک ایک انگریز مہتمم مقرر کیا جو سرکاری صاحبان ضلع کی ہدایت اور نگرانی کرتا تھا۔ پھر رزیڈنٹ کے کہنے سننے سے گورنر جنرل ارل مونٹرا نے طے کیا کہ انگریزی حکومت جو روپیہ پامر کمپنی کا آتا ہو مع کچھ زائد روپیہ کے اسے دے دے اور اس کے معاوضے میں شمالی سرکاروں کی جو پیش کش نواب آصف جاہ ثانی کے زمانے

سے جاری ہے وہ ہمیشہ کے لئے بند کردی جائے - اس طرح سے حیدرآباد کو بامر کمپنی کے قرضے سے تو نجات ملی لیکن ایک مستقل آمدنی کم ہوگئی اور فوج پر جو روپیہ خرچ ہوتا تھا وہ ویسا کا ویسا ہی رہا -

۵ - نواب سکندر جاہ بہادر کے زمانے میں بمبئی اور مدراس تک پختہ سڑکیں بنائی گئیں اور میر عالم نے ہر منزل پر مسجد، سرائے اور کنواں تعمیر کرایا - تم میں سے تقریباً ہر ایک نے اس عظیم الشان تالاب کا نام سنا ہوگا جو حیدرآباد کی عیدگاہ کے قریب میر عالم کے نام پر موسوم ہے - نواب سکندر جاہ نے اپنے انتقال سے پہلے انگریزوں کی "اعانتی فوج" کے آرام و آسائش کے لئے حسین ساگر کے دوسری جانب خاص شہر حیدرآباد سے پانچ میل کے فاصلے پر ایک شہر آباد کیا جو سکندرآباد چھاونی کے نام سے مشہور ہوا -

۶ - نواب سکندر جاہ کے انتقال پر ان کے صاحبزادے نواب ناصر الدولہ میر فرخندہ علی خاں بہادر مسند حیدرآباد پر رونق افروز ہوئے اور اکبر شاہ ثانی بادشاہ دہلی نے ان کی استدعا پر ان کی مسند نشینی کو تسلیم کر کے انھیں مظفر الملک، نظام الدولہ، افضل اراکین سلطنت، آصف جاہ، فتح جنگ، سپہ سالار، یار وفادار، رستم دوراں، ارسطوئے زماں کے عالی شان خطابات دیئے - ادھر

نواب ناصر الدولہ نے اپنی جاگیر کے نو مواضعات جو شمالی ہند میں واقع تھے، شہنشاہ دہلی کو پیش کش میں دے دیئے ۔ ان کی مسند نشینی سے پہلے رزیڈنٹ اور اعلیٰ حضرت کی باہمی مراسلت میں رزیڈنٹ ہمیشہ اپنے آپ کو "نیاز مند" کر کے لکھتا تھا اور اعلیحضرت اپنے لئے "تابدولت" استعمال کرتے تھے، لیکن آیندہ یہ الفاظ جو نواب آصف جاہ ثانی کے زمانے سے چلے آ رہے تھے ترک کر دئے گئے ۔ نواب ناصر الدولہ نے مسند نشین ہوتے ہی گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز کو لکھا کہ عہد ناموں کی رو سے مجھے اپنے ملک پر کامل اقتدار ہے لہذا میں اپنے ملکی انتظام سے انگریز عہدہ داروں کو نکالنا چاہتا ہوں، اور چونکہ نہ تو رزیڈنٹ نے نہ گورنر جنرل نے اس پر اعتراض کیا اس لئے ملکی انتظام سے رزیڈنٹ کا عمل دخل جاتا رہا ۔ لیکن ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی اور ایک طرف تو حیدر آبادی باقاعدہ افواج کا خرچ اور قرضہ پر سود روز بروز بڑھتا جا رہا تھا دوسرے اخراجات میں بھی کمی نہ تھی ۔ مہاراجہ چندو لال برابر پیشکاری کے فرائض انجام دیتے رہے اور جس طرح خانگی خیر خیرات میں ان کا ہاتھ روکنے کی کوئی شکل نہ تھی اس طرح ریاست کے اخراجات بھی بڑھتے ہی گئے ۔ بالآخر جب کام چلتا نظر نہیں آیا تو آخرکار انھوں نے استعفا دے دیا اور چند ماہ بعد ان کا انتقال بھی ہو گیا ۔

۷ ۔ اب نواب ناصر الدولہ نے، جو اپنے والد مرحوم کی بے بسی سے واقف تھے اور سرکاری اختیارات یا بے اختیاری کا بھی انھیں اندازہ تھا، دوسرا ایسا دیوان یا پیشکار مقرر کرنے سے انکار کر دیا جو مہاراجہ چندو لال کی برابر ذی اقتدار ہو، اور وہ کچھ روز تو بغیر کسی مدار المہام کے حکومت کرتے رہے اور پھر یکے بعد دیگرے کئی مدار المہاموں کو اپنے اختیار سے مقرر کیا اور علیحدہ کیا۔ انھوں نے قرضے کی رقم اور سود کا ایک معتد بہ حصہ بھی خود اپنے پاس سے ادا کیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا تھا؛ انگریزوں کا قرضہ سود کی وجہ سے بڑھتا جاتا تھا اور ملک کی بد انتظامی کی وجہ سے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے، یہاں تک کہ اعلیحضرت نے ایک نیم انگریزی شرکت کے پاس اپنے جواہرات رہن کر کے قرضہ ادا کرنا چاہا۔ لیکن اب ڈلہوزی گورنر جنرل ہند ہو گیا تھا اور اس نے کسی قسم کے انگریزی کمپنی کے قیام کی اجازت دینے سے انکار کیا، بلکہ اس کے بجائے روپیہ کا تقاضا کیا اور کہا کہ نظام حیدرآباد روپیہ ادا نہیں کر سکتے تو اپنی قلمرو کے چند اضلاع ہمارے حوالہ کر دیں تاکہ قرضہ بھی ادا ہو جائے اور فوج کے اخراجات بھی پورے ہو سکیں۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے کا برطانوی رزیڈنٹ جنرل فریزر دل سے حیدرآباد اور اس کے فرمانروا کا خیر خواہ تھا، چنانچہ جب اس نے دیکھا کہ گورنر جنرل کے سامنے میری نہیں چلتی تو کسی خانگی کام کے بہانے سے استعفاء دیدیا۔

۸ - فریزر کے چلے جانے کے بعد گورنر جنرل نے پھر دباؤ ڈالا اور آخر کار مدار المہام سراج الملک اور خود نواب ناصر الدولہ نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ بغیر ملک کا ایک حصہ حوالہ کئے ہوئے کام نہیں چل سکتا۔ الغرض انگریزوں اور سرکار نظام کے مابین ۱۸۵۳ء میں ایک عہد نامہ ہوا جس کے بموجب رائچور کے دوآبہ اور برار پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور قرار پایا کہ آئندہ حیدر آباد کی اعانتی فوج کی تنخواہ انگریز اسی کی آمدنی سے ادا کریں گے اور سرکار نظام کو اس سے کچھ تعلق نہ رہے گا۔ نیز آئندہ سوائے اس اعانتی فوج کے انگریز سرکار نظام سے کسی قسم کی فوجی مدد کا مطالبہ نہیں کریں گے۔ اس عہد نامے کے چھٹے روز سراج الملک کا انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ وہ شخص خدمت مدار المہامی پر مقرر ہوا جس نے حیدر آباد کا پانسہ پلٹ دیا اور اس ملک کو گویا ایک ایسے گڑھے میں گرنے سے بچایا جس سے وہ شاید کبھی بھی نہ نکلتا۔

۸ - الغرض سراج الملک کی جگہ ان کے بھتیجے میر نواب تراب علی خاں نواب سالار جنگ اول عہدہ مدار المہامی پر سرفراز ہوئے اور فوراً قلمرو ئے حیدر آباد کی اصلاح کی فکر کرنے لگے۔ ان کی اصلاحات اور کارناموں کا زیادہ حصہ تو اگلے باب میں بتایا جائے گا یہاں صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلمرو ئے سرکار عالی کی ایسی چیزوں کے ترقی کی طرف توجہ کی اور تاریخ حیدر آباد میں پہلی مرتبہ

چادر گھاٹ میں حیدر آباد کی دیسی چیزوں کی نمائش کی۔ پھر ان سے پہلے حیدر آباد میں غریب لوگ اپنا پیٹ پالنے کی خاطر بچوں کو فروخت کر دیتے تھے، نواب سالار جنگ نے یہ اعلان شائع کیا کہ آیندہ جو کوئی بھی ایسا کرے گا اُسے سخت سخت سزائیں دی جائیں گی۔ نیز چونکہ خزانہ میں روپیہ نہیں تھا اس وجہ سے اس وقت تک یہ قاعدہ تھا کہ بجائے نقد تنخواہ دینے کے عرب جمعداروں کو بڑی بڑی جاگیریں دے دی جاتی تھیں تاکہ وہاں کی آمدنی سے تنخواہیں ولائی جایا کریں؛ اب سالار جنگ نے ساہو کاروں سے قرضہ لے کر ان جمعداروں کو دے دیا اور جو زمینیں ان کے قبضے میں تھیں اُنھیں چھڑا لیا۔ یہ سب ابھی ہو رہا تھا کہ ہندوستان میں غدر کے طوفان کی وجہ سے اور یہاں دکن میں نواب ناصر الدولہ بہادر کی وفات کے باعث نواب سالار جنگ کو یہ سب کام ملتوی کر دینے پڑے۔

باب ۱۶

نواب افضل الدولہ بہادر

(۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۹ء)

۱۔ نواب ناصر الدولہ بہادر کے انتقال پر ان کے بڑے صاحبزادے افضل الدولہ نواب میر تہنیت علی خاں بہادر مسند نشین ہوئے۔ ان کی مسند نشینی کا زمانہ تمام ملک ہند کے لئے نہایت ہی نازک زمانہ تھا، اس لئے کہ اس مبارک واقعہ کے چند ہی روز پہلے تمام شمالی ہند میں غدر کا ہولناک فساد برپا ہو گیا تھا، چنانچہ میرٹھ، دہلی، جھانسی، اور وسطی ہند میں جگہ جگہ ہندوستانی فوج نے سرکشی اختیار کر کے انگریزوں کو اپنے اپنے علاقے سے نکال باہر کیا تھا، اور اپنی دانست میں خاندان تیموری کے آخری چراغ بہادر شاہ دوم کو از سر نو تمام پرانے اختیارات دے کر تخت شاہی پر بٹھا دیا تھا۔ اس موقع پر (جیسا گورنر بمبئی نے اپنے ایک تار میں بیان کیا تھا) اگر کہیں نواب افضل الدولہ بہادر یا ان کے وزیر با تدبیر نواب سالار جنگ کے قدم ڈگمگا جاتے

تو غدر کی آگ دہلی سے حیدرآباد ہوتی ہوئی مدراس اور جزیرہ نمائے
دکن کے جنوب ترین حصے میں پہنچ جاتی۔ لیکن پھر کیا ہوتا؟ شاید
باغیوں کو فوری کامیابی ہو جاتی، لیکن اول انگریزوں کو کامیابی
ہوتی آخر ہوتی، اور حیدرآباد اور اس کا پیارا خاندان شاہی خدانخواستہ
کہیں کا نہ رہتا۔ یہ سالار جنگ کی کمال بیدار مغزی اور دور اندیشی
کا ثبوت ہے کہ وہ حیدرآباد کی کشتی کو اس بھنور سے نکال
لے گئے اور اپنی وفاداری آخر منٹ تک قائم رکھی۔

۲۔ یہ نہیں کہ غدر کی چنگاری نے یہاں اثر نہ کیا ہو،
شورش اور بے چینی کے آثار تین مختلف حصوں میں ہوئے یعنی
ایک تو شوراپور کا راجہ جس کی ریاست رائچور کے قریب تھی باغی
ہو گیا، پھر اورنگ آباد کے ہندوستانی فوج کے ایک حصہ نے
حکم ماننے سے انکار کر دیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ خاص
پایۂ تخت حیدرآباد میں شورشیوں نے مکہ مسجد میں سبز اسلامی
جھنڈا کھڑا کر دیا اور ایک گروہ نے خاص رزیڈنسی پر حملہ کر دیا۔
شروع ہی سے سالار جنگ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ذرا بھی کسی
شورش کی خبر سن پاتے تو فوراً رزیڈنٹ کو اطلاع کرتے اور
رزیڈنٹ ہماری سرکاری فوج کی مدد سے اس کا خاتمہ کر دیتا۔
جب دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہوا ہے تو رزیڈنٹ بڑا گھبرایا اور
سالار جنگ کو بلا کر وہ تار دکھایا جو گورنر جنرل کے پاس سے

اس کے پاس آیا تھا۔ سالار جنگ نے کمال اطمینان کے ساتھ کہا کہ جناب، ہمیں اور حیدرآباد والوں کو تو یہ خبر تین روز سے معلوم ہے؛ آپ اطمینان رکھیں، میرے آقا کے والد ماجد نواب ناصر الدولہ بہادر نے مرتے دم میرے آقا کو اور مجھے وصیت کی تھی کہ انگریزوں کا ساتھ نہ چھوڑنا؛ پھر اس کے بعد میرے آقا یا میں خود کیسے آپ کی وفاداری سے منھ موڑ سکتے ہیں، اسی لئے آپ یقین مانئے کہ ہم آئندہ اتنے ہی وفادار رہیں گے جتنے پہلے تھے۔ الغرض غدر کے نازک ترین زمانے میں بھی نواب افضل الدولہ بہادر اور سالار جنگ دونوں نے باغیوں کو دبا دیا اور انگریزوں کے ساتھ جو وفاداری چلی آرہی تھی اس سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹے۔

۳۔ جب غدر فرو ہوا اور ہندوستان میں انگریزوں کی دھاک پہلے سے بھی زیادہ بیٹھ گئی، اس وقت لوگوں کو سالار جنگ کی دور اندیشی کا پوری طور سے اندازہ ہوا۔ ۱۸۵۸ء میں قدیم برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاتمہ ہو گیا اور حکومت ہند براہ راست انگلستان کی ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے سپردگی میں آگئی۔ انگریزی حکومت کو حیدرآباد کی وفاداری کی اہمیت کا پورہ اندازہ تھا، چنانچہ نہ صرف یہ کہ شوراپور کا راج ممالک محروسہ سرکار عالی میں شامل کر دیا گیا بلکہ رائچور کا دوآبہ بھی (جس پر براڑ کے ساتھ ساتھ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا) اعلیٰحضرت کو واپس مل گیا، اور قرار پایا کہ براڑ

کے پٹے کے معاوضے میں رزیڈنسی کی طرف سے قرضے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، لیکن ساتھ ہی سرکار نظام کو برار کے حسابات سمجھانے کے مطالبہ کا بھی موقعہ نہیں رہے گا۔ غدر کے بعد تک حیدرآباد کا کوئی جداگانہ سکہ نہ تھا بلکہ جو سکہ یہاں رائج تھا اس پر شہنشاہ دہلی کا نام کندہ ہوتا تھا اور اسی طرح فرمانروائے دکن کے مہر پر اعلیٰحضرت کا نام شہنشاہ دہلی کے نام کے ساتھ ساتھ کندہ ہوتا تھا۔ اب غدر کے بعد بہادر شاہ بادشاہ کو انگریزوں نے رنگون میں قید کر دیا جس کی وجہ سے دہلی کا کوئی بادشاہ ہی باقی نہ رہا کہ اس کا سکہ یہاں حیدرآباد میں چلتا، لہذا رزیڈنٹ کے ایما سے ایک نئے سکے کا چلن ہوا جس میں سے شہنشاہ دہلی کا ذکر اڑا دیا گیا، اور اسی طرح اعلیٰحضرت کی سرکاری مہر میں سے دہلی کا حوالہ نکال دیا گیا۔

۴۔ غدر کے فرو ہونے اور ہندوستان میں دوبارہ امن امان قائم ہونے کے بعد سالار جنگ کو حکومت میں از سر نو اصلاحیں کرنے کا موقعہ ملا۔ اگر ہم غور کریں تو آج کل کے انتظامات جن کی وجہ سے فضل الٰہی سے حیدرآباد بجا طور پر مشہور ہے، ان سب کی ابتدا سالار جنگ بہادر کے عہد سے شروع ہوتی ہے۔ سب سے پہلے تو انھوں نے اس پرانے طریقہ کو مسدود کیا جس کے مطابق مختلف اضلاع ہراج ہو کر ٹھیکہ پر دے دئے جاتے

تھے اور ان کی بجائے باضابطہ تعلقہ داروں اور ان کے عملے کا تقرر کیا۔ ساتھ ہی تمام ملک کو چار صوبوں، سترہ ضلعوں اور بہت سی تحصیلوں میں منقسم کیا اور صوبہ دار، تعلقہ دار اور تحصیلدار تمام ملک میں پھیلا دیئے جو اپنے کردار کے جواب دہ رہتے تھے۔ پھر انھوں نے تمام ملک کی باضابطہ پیمائش کرائی اور مالگزاری کے تعین کے اصول بنائے۔ اس وقت تک عدالتوں کی حالت نہایت خراب تھی اور ایک طرف تو امراء پر اور دوسری جانب چوروں ڈاکوؤں پر ان کا خاطر خواہ اثر نہیں تھا؛ سالار جنگ نے صرف پائے تخت میں عدالتوں کی تعداد میں اضافہ کیا بلکہ ہر ضلع میں ایک ایک میر عدل اور منصف کا تقرر کیا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام احکامات کے صحیح نفاذ کے لئے پولیس کی ضرورت تھی، چنانچہ اسے از سر نو ترتیب دیا گیا اور حکومت کو پہلے سے زیادہ کاروباری بنانے کے لئے حیدرآباد میں ایک مجلس مالگزاری اور ایک معتمدی قائم کی گئی۔ شاید سب سے اہم اصلاح جو سالار جنگ نے کی وہ یہ تھی کہ انھوں نے حیدرآباد میں ایک مدرسہ عالیہ قائم کیا اور ہر تعلقے میں دو دو مدارس بنائے جن میں سے ایک میں فارسی میں اور دوسرے میں ملکی زبان میں تعلیم ہوتی تھی، اور اس طرح گویا حیدرآباد کی آیندہ عظمت کا بنیادی پتھر رکھ دیا۔

۵ — ان سب اصلاحات اور نیک نیتی کا طفیل تھا کہ حیدرآباد میں سینکڑوں دشمنوں کے ہوتے ہوئے نواب افضل الدولہ کے عہد میں سالار جنگ اپنے عہدہ وزارت سے ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ان پر بعض بدمعاشوں نے بندوقوں کے وار کئے، انھیں بدنام کیا، طرح طرح کے شکایتیں کیں، لیکن وہ برابر اپنے کام میں لگے رہے اور نواب افضل الدولہ بہادر کے آخری دم تک برابر ان کے وفادار اور جان نثار بنے رہے۔

باب ۱۷

حضرت میر محبوب علی خاں بہادر غفران مکاں

(۱۸۶۹ء تا ۱۹۱۱ء)

۱۔ نواب افضل الدولہ بہادر کے انتقال کے بعد ان کے
ماجزادے نواب میر محبوب علی خاں (جو محبوب علی پادشاہ کے
م سے مشہور ہیں) صرف تین سال کے عمر میں تخت پر بیٹھے، اور
گورنر جنرل کی منظوری سے ریاست کے کاروبار سنبھالنے کے
ے نواب سالار جنگ بہادر اور نواب شمس الامراء بہادر متولی قرار
ئے۔ اعلیحضرت مرحوم کا ابتدائی زمانہ کلیتہً ان ہی دو امرائے
مدار کے نگرانی میں بسر ہوا، اور جن اصلاحات کی نواب
افضل الدولہ مرحوم کے زمانے میں ابتدا ہوئی تھی وہ برابر جاری
ہیں اور کمال کو پہنچیں۔ اعلیحضرت کی تخت نشینی کے چھ سات
ں بعد نواب سالار جنگ صوبۂ برار کے واپسی کے کوشش
رنے کی غرض سے لندن گئے جہاں ان کی بڑی آؤ بھگت
وئی مثلاً وہ ایک دن خاص ملکہ وکٹوریہ کے مہمان رہے اور شہزادہ ویلز

نے (جو بعد میں چل کر شاہ ایڈورڈ ہفتم قیصر ہند ہوئے) ان کی دعوت قبول کرکے (انگریزوں کی نظر میں) ان کی عزت میں چار چاند لگائے۔ لیکن برار واپس نہیں ملا۔ جب ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ نے "قیصر ہند" کا خطاب اختیار کیا تو اس کے اعلان کے غرض سے گورنر جنرل لارڈ لٹن نے دہلی میں ایک بڑا بھاری دربار منعقد کیا جس میں تمام ہندوستان کے بڑے بڑے والیان بلائے گئے؛ جناب نواب سالار جنگ بہادر بھی اپنے آقا اعلیٰحضرت کو لے کر اس دربار میں گئے اور وہاں ان کا بڑا اعزاز و اکرام ہوا۔

۲۔ اس واقعہ کے چند سال بعد نواب سالار جنگ بہادر نے ٹھیک تیس برس مدار المہامی کرنے اور بکمال وفاداری اور تدبر کے ساتھ تین آقاؤں کی خدمت کرنے کے بعد انتقال کیا۔ اعلیٰحضرت پر اس واقعہ کا اس قدر اثر پڑا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس کے ایک سال بعد جب اعلیٰحضرت سن بلوغ کو پہنچے تو ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے خود گورنر جنرل لارڈ رپن نے حیدرآباد آکر انھیں تمام اختیارات حکومت سپرد کئے۔ یہ پہلے گورنر جنرل تھے جنھوں نے قلمرو سرکار نظام میں قدم رکھا تھا، اور ان کے بعد یہ گویا قاعدہ ہو گیا کہ ہر گورنر جنرل ہندوستان سے جانے سے پہلے حیدرآباد ضرور آتا ہے۔ سالار جنگ کے انتقال کے بعد جو مجلس تولیت قائم ہوئی تھی اس کے شاید سب سے اہم رکن نواب سالار جنگ ثانی

تھے اور اعلیحضرت کے اختیارات ملنے پر وہی مدار المہام مقرر ہوئے لیکن انھوں نے چند ہی سال بعد استعفا دے دیا اور ان کے بعد پہلے سر آسمان جاہ، ان کے بعد سر وقار الامراء اور پھر مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنۃ بہادر مدار المہام مقرر ہوئے، اور آخر الذکر اعلیٰ حضرت کے انتقال پُر ملال تک برابر مدار المہامی کے فرائض انجام دیتے رہے۔

۳۔ اعلیٰ حضرت مرحوم نے یہ دکھا دیا کہ وہ سرکار عظمت مدار کے کس قدر وفادار ہیں اور ان کے زمانے میں انگریزوں نے ہندوستان کے قریب جتنی بھی لڑائیاں لڑیں انھوں نے سب میں اپنی قلم و اور اپنی فوج کی خدمات پیش کیں۔ پھر جب ہندوستان کو روسیوں کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا تو انھوں نے ساٹھ لاکھ کی عظیم الشان رقم انگریزی حکومت کے سامنے پیش کی کہ اس کے ذریعہ آپ سرحد کی حفاظت کیجئے۔ لیکن گورنر جنرل نے انھیں جواب دیا کہ یہ روپیہ شکریہ کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے، آپ اس کے بجائے ایسی باقاعدہ فوج کا انتظام فرمائیے جو آڑے وقت ہمارے کام آئے۔ الغرض اس روپیہ سے امپیریل سروس فوج کی بنیاد ڈالی گئی اور حیدرآباد کی دیکھا دیکھی دوسری ریاستوں نے بھی اسی طرح اپنی بساط کے موافق ایسے لشکر ترتیب دئے جو ضرورت کے وقت شہنشاہی حکومت کے کام آسکیں۔ پھر

جب ملکہ وکٹوریہ کی اکہترویں سالگرہ کے جشن کی تیاریاں مکمل ہو چکیں تو اعلیٰ حضرت نے اپنی طرف سے نواب سر وقار الامراء بہادر کو لندن روانہ کیا جہاں انھیں دل کھول کر خوش آمدید کہا گیا، اور جب ۱۹۰۲ء میں ملکہ وکٹوریہ کے انتقال کے بعد شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم کے تخت نشینی کے موقعہ پر گورنر جنرل لارڈ کرزن نے دہلی میں دربار کیا تو اعلیٰ حضرت اپنے پیارے ولیعہد نواب میر عثمان علی خاں بہادر اور اپنے وزیر ہز ایکسیلنسی مہاراجہ سر کشن پرشاد یمین السلطنۃ بہادر کے ساتھ دہلی تشریف لے گئے اور بنفس نفیس اس دربار میں شرکت کی۔

۴ ۔ لیکن باوجود تمام کوششوں کے اعلیٰ حضرت صوبہ برار کو واپس نہ لے سکے، اور آخر کار ۱۹۰۲ء ہی میں لارڈ کرزن کے اصرار سے انھیں اس کا دوامی پٹہ لکھنا پڑا، یعنی قبضہ انگریزوں ہی کا رہا، گو اعلیٰ حضرت پہلے کی طرح اس ملک کے مالک رہے اور انھیں سال بسال پچیس لاکھ روپیہ بطور پیشکش کے ملنا قرار پایا؛ نیز یہ بھی قرار پایا کہ سالگرہ مبارک کے دن صدر مقام برار یعنی امراؤتی میں اعلیٰ حضرت کا علم بلند ہوا اور ۲۱ توپوں کی سلامی داغی جایا کرے۔ خاص قلمرو حیدر آباد میں بھی طرح طرح کی اصلاحات ہوئیں، مثلاً ایک عدالت العالیہ قائم ہوئی، ایک دار العلوم قائم ہوا جس سے طلبہ عربی فارسی کے عالم و

فاضل بن کر نکلتے تھے، اور جب موجودہ شاہ انگلستان و شہنشاہ ہند ۱۹۰۶ء میں بحیثیت شہزادۂ ویلز (یعنی ولیعہد) حیدرآباد آئے تو ان کے آنے کی یادگار میں زنانہ شفاخانہ قائم ہوا اور ایک مردانہ زنانہ میڈیکل اسکول قائم ہوا جس میں ڈاکٹری پڑھائی جاتی تھی۔ اعلیٰ حضرت کے عہد میں جدید خوش نما دینیاری سکہ (جیسے اس زمانے میں سکۂ محبوبیہ کہتے تھے) رائج ہوا اور سرکاری شفاخانے نے بھی دن دونی رات چوگنی ترقی کی۔

۵ - اعلیٰ حضرت نے صرف یہی نہیں کیا کہ رعایا کا فائدہ آرام اور آسائش کے لئے مختلف محکمے قائم کریں بلکہ ان کے خیالات و خواہش معلوم کرنے اور حکومت کو پہلے سے بہتر بنانے کے غرض سے پہلے تو اپنے مدارالمہام اور معین المہاموں (یعنی وزیر اعظم اور وزرا) کی ایک مجلس قائم کی جس کا نام انہوں نے "کیبنٹ کونسل" (یعنی مجلس کابینہ) رکھا اور اس کے بعد ایک "لیجس لیٹو کونسل" یعنی مجلس مقننہ قائم کی تاکہ جو قوانین ملک سرکار عالی میں رائج کئے جائیں وہ نہایت غور و خوض کے بعد نافذ ہوں۔ اس مجلس مقننہ میں علاوہ وزیروں کے بڑے بڑے عہدہ داروں کے ملک کے بڑے بڑے طبقوں یعنی جاگیرداروں، ساہوکاروں اور وکلا کے قائم مقام مقرر ہوتے

لگے اور حیدرآباد کے بلدیہ اور مختلف صوبوں کے لوکل بورڈوں کے قائم مقام بھی اس میں آنے اور بیٹھنے لگے۔ پھر اعلیٰحضرت نے یہ بھی کیا کہ ملک کے انتظام کے لئے جتنے بھی شعبے قائم کئے گئے تھے انھیں مدار المہام اور باقی تین معین المہاموں میں اس طرح سے تقسیم کر دیا کہ کسی قسم کے باہمی رقابت باقی نہ رہے اور ہر معین المہام کے ذمے ایک ہی قسم کے مختلف شعبے رہ جائیں۔ جس مفصل فرمان مبارک کے ذریعے سے حکومت میں یہ سب تبدیلیاں کی گئیں اسے "قانونچہ مبارک" کہتے ہیں۔

۱۱۔ اعلیٰحضرت کو جو محبت اپنی عزیز رعایا کے ساتھ تھی اس کے امتحان کا موقعہ موسی ندی کے مشہور تباہ کن طوفان کے وقت ہوا۔ جن لوگوں نے اس قیامت خیز طوفان کو دیکھا ہے یا اس کا مفصل حال پڑھا ہے وہ بتا سکتے ہیں کہ اس سے اس ملک کو کس قدر شدید نقصان پہنچا، اور جو لڑکے لڑکیاں بلدۂ حیدرآباد سے واقف ہیں وہ اس کے زور کا اس بات سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک طرف پتھر گھٹی اور دوسری جانب افضل گنج تقریباً سب کا سب پانی کے نیچے تھا اور تمام پلوں کے اوپر ملیوں پانی بہہ رہا تھا۔ خیر، افضل گنج اور پتھر گھٹی تو دونوں ازسرِ نو تعمیر ہو گئے، لیکن پرانے پل اور مسلم جنگ کے پل کے درمیان جو گنجان آبادی تھی اس کا تو پتہ بھی نہیں رہا اور آج تک وہ حصہ بالکل ویران

پڑا ہوا ہے۔ اعلیحضرت اس مصیبت کی خبر سن کر قصر فلک نما سے افضل گنج خود تشریف لائے اور اپنی پیاری رعایا کو پریشان اور عورتوں، مردوں، بچوں اور جانوروں کی لاشوں کو بہتا ہوا دیکھ کر ان پر نہ رہا گیا اور بہت دیر تک رویا کئے۔ انھوں نے فوراً حکم دیا کہ میرے محلات شاہی میری عزیز رعایا کے لئے کھول دئے جائیں اور بغیر کسی قسم کے تفریق کے ہندو مسلمان سب کو سرکار کی جانب سے کھانا دیا جائے، چنانچہ سرکاری محلات کے وہ کمرے جن پر اس سے پہلے کسی غیر کی نگاہ بھی مشکل سے پڑتی تھی ان میں سرکار کی غریب رعایا نے اپنی شدید مصیبت کے دن امن چین سے گزارے۔

۷۔ اعلیحضرت رحمۃ اللہ علیہ کے داد و دہش سے ہزاروں لاکھوں کو فائدہ پہنچتا تھا اور ان کی خیر خیرات ہی تھی کہ جب ان کے انتقال پر ان کا جنازہ فلک نما سے مکہ مسجد آیا ہے تو خلقت سڑک کے دونوں طرف جوق جوق کھڑی ہوئی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ اعلیحضرت نے لوگوں کے دلوں میں اپنا گھر کر لیا تھا اور آج تک حیدرآباد والے جتنا اپنے اس بادشاہ کو یاد کرتے ہیں اتنا اس سے پہلے کے کسی فرمانروا کو یاد نہیں کرتے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

باب ۱۷

ہز اگزالٹڈ ہائی نس
اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ
تخت نشینی سنہ ۱۹۱۱ء)

۱ - ہمارے موجودہ بادشاہ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ سنہ ۱۹۱۱ء میں اپنے والد ماجد حضرت غفران مکان کے انتقال پر ملال پر تخت حیدرآباد پر بیٹھے، اور بیٹھتے ہی حیدرآبادی حکومت کے ہر ایک شعبہ کے اصلاح کی کوشش شروع کر دی۔ ان کے لڑکپن ہی میں اعلیٰ حضرت مرحوم نے یہ حکم دے دیا تھا کہ روز مقررہ پر ہر محکمہ کا معتمد ان کے سامنے کاغذات پیش کرے تاکہ انھیں امور عامہ میں کافی مہارت حاصل ہو جائے۔ غالباً اسی گہری واقفیت کی وجہ سے انھیں اپنی قلمرو کے حالات سے کافی تشفی نہیں ہوتی تھی، چنانچہ ابتدا میں انھوں نے جلد جلد مدار المہاموں کو تبدیل کیا۔ انھوں نے پہلے راجہ راجایان مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر اور ان کے بعد نواب سالار جنگ بہادر سوم کو مدار المہام بنایا اور آخر کار پانچ

سال کے طویل زمانے میں مدار المہامی کے نہایت دقت طلب فرائض خود انجام دیئے۔ جب ہر شعبہ حکومت پر خود سرکار کا اثر پڑا تو حکومت کے شعبے گویا نکھر گئے اور ان پر سے گویا زنگ ہٹ گیا۔ پانچ سال بنفس نفیس مدار المہامی کے فرائض انجام دینے کے بعد انھوں نے سر علی امام نواب مؤید الملک بہادر کو جو خود گورنر جنرل ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہ چکے تھے اور جن سے زیادہ اس زمانے میں کوئی واقف کار نہیں سمجھا جاتا تھا، طلب کر کے حکم دیا کہ تم ہماری سلطنت کے سیاسی دستور کا ایک خاکہ تیار کر دو۔ جب وہ یہ خاکہ تیار کر چکے اور اس کا نفاذ ہو گیا تو ان کے بعد نواب ولی الدولہ بہادر منصرم صدر اعظم ہوئے اور آخر کار سرکار نے اپنے اور اپنے والد ماجد مرحوم کے وفادار مدار المہام مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر یمین السلطنۃ کو از سر نو طلب فرما کر صدر اعظمی کا جائزہ دیا، چنانچہ مہاراجہ بہادر آج تک اس عہدہ پر فائز ہیں۔

۳۔ الغرض سر علی امام بہادر کے بنائے ہوئے خاکے کو اعلیٰ حضرت نے منظور فرمایا اور اس کے ذریعہ سے پرانی مجلس کابینہ کی جگہ ایک جدید "مجلس باب حکومت" مقرر کی گئی، جس کے صدر کا خطاب صدر اعظم باب حکومت مقرر ہوا اور جس نے قدیم مدار المہام کی جگہ لے لی۔ اس کے ساتھ ہی صدر المہاموں کی (جو وزرا کا دوسرا نام ہے) کی تعداد سات قرار دی گئی تاکہ

ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے شعبوں کی کماحقہٗ نگرانی کر سکے۔ نیز یہ بھی قرار پایا کہ ہر صدر المہام کا ایک ایک معتمد ہو اور اس شعبہ کے تمام امور اس معتمد کے وساطت سے صدر المہام یا باب حکومت کے گوش گزار کئے جائیں۔ ایسے ایسے اہم محکمے جیسے تعلیمات، طبابت، ڈاک، صنعت و حرفت وغیرہ ایک ایک ناظم کے زیر نگرانی میں ہیں جو اپنی کارروائیاں معتمد کے ذریعے سے صدر المہام تک پہنچاتے ہیں۔ ملکی انتظام کے لئے ملک چار صوبوں اور ہر صوبہ ضلعوں اور تعلقوں میں منقسم ہے، اور ہر صوبے میں علاوہ صوبہ دار کے ایک ناظم صوبہ (جس کے سپرد عدالتی کام ہیں) ایک ایک مہتمم کوتوالی اور ایک ایک ڈاکٹر سیول سرجن رہتا ہے؛ اسی طرح ہر ضلع اور ہر تعلقے میں بھی ان عہدہ داروں کے ماتحت چھوٹے چھوٹے عہدہ دار رہتے ہیں۔

۳۔ ان انتظامات کی وجہ سے اعلیٰ حضرت کے مبارک عہد میں ہماری قلمرو نے دن دونی رات چوگنی ترقی کی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے دنیا میں شائد ہی ایک ملک ہوگا جہاں سالہا سال سے (بجائے پہلے کی طرح آمدنی کے بہ نسبت اخراجات زیادہ ہونے کے) یہاں کے موازنے میں بچت ہی بچت ہوتی ہے، جس کا سہرا ہمارے ہر دل عزیز اور جفاکش وزیر مالیات سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر کے سر ہے۔ کہاں تو پچاس برس پہلے حیدرآباد قرضے کے بار سے بالکل ہی دبا جاتا تھا، کہاں اب ہر سال لاکھوں روپئے بچتے ہیں

اور انھیں رعایا کے فلاح و بہبود کے لئے خرچ کیا جاتا ہے۔
اعلیٰحضرت کے تخت پر تشریف آوری کے وقت قلمرو کی آمدنی تقریباً پانچ کروڑ تھی لیکن آج وہ تقریباً دوگنی ہو کر آٹھ کروڑ سے زیادہ ہوگئی ہے۔ پھر کہاں تو کسی زمانے میں یہ ریاست اپنے تنخواہ داروں کی تنخواہیں بھی قرض لے لے کر دیتی تھی اور اپنے رقبے کے رقبے اس میں آڑ کر دیتی تھی، کہاں ملک ہند کا مشکل سے کوئی صوبہ ہوگا جہاں کے خیراتی اور تعلیمی اور رفاہ عام کی انجمنوں کو اس ریاست اید مدت سے ہزاروں کی امداد نہ دی جاتی ہو۔ پچھلی جنگِ عظیم میں، جو انگریزوں اور ان کے حلیفوں نے جرمنی وغیرہ سے لڑی اعلیٰحضرت نے اپنی انتہائی وفاداری کا ثبوت دیا اور اپنے عزیز روپیہ میں سے کم و بیش چھ کروڑ خرچ کر کے دامے، درمے، قدمے، سخنے سلطنت ہند کی امداد کی، چنانچہ جنگ کے بخیر و خوبی ختم پانے پر اعلیٰحضرت کو وہ خطاب ملا جو کسی دوسرے ہندوستانی فرماں روا کو حاصل نہیں، یعنی آیندہ سے اعلیحضرت ہز اگزالٹیڈ ہائینس اور یار وفادار دولت برطانیہ کہلانے لگے۔
۴۔ جیسا اوپر لکھا جا چکا ہے اعلیٰحضرت کے مبارک عہد میں سال بسال روپیہ کی جو بچت ہوئی اس کی وجہ سے رعایا کے فائدے اور آرام و آسائش کے مختلف محکموں میں طرح طرح

کی ترقیاں ہوئیں، چنانچہ شاید سب سے پہلا اہم کام جو تخت نشینی کے بعد سرکار نے اپنے دست مبارک سے کیا وہ عثمان ساگر کا سنگ بنیاد نصب کرنا تھا تاکہ موسی ندی نے جو تین سال پہلے حیدرآباد کو گویا بہا دیا تھا اس کی سزا میں اس کو قید کر دیا جائے، اور جہاں تک انسانی تدبیر کا تعلق ہے آیندہ اس ندی کا پانی کسی کو دق نہ کرے۔ اعلیٰ حضرت کے عہد میں تیار کی ہوئی جھیلوں یعنی عثمان ساگر، حمایت ساگر اور سب سے بڑی جھیل نظام ساگر کا جو ذکر سنتے ہو، ان سے آب پاشی بھی ہوتی ہے اور عثمان ساگر سے شہر حیدرآباد میں پانی نلوں کے ذریعے سے صاف شفاف ہو کر آتا ہے۔ پھر ایوان عدالت العالیہ عثمانیہ (جو عدل و انصاف کا مرکز ہے) عثمانیہ دواخانہ جس پر لاکھوں روپیہ محض امیر و غریب کے علاج کے وسائل کے لئے خرچ کر کے بنوایا ہے، بلدے کی چوڑی چوڑی سڑکیں جس پر گرد کا نام نہیں رہا، ممالک محروسہ میں جگہ جگہ بجلی کی روشنی اور ٹیلیفون کا انتظام، ان میں سے زیادہ تر رفاہ عام کے کام اعلیٰ حضرت کے عہد کے مرہون منت ہیں۔ اعلیٰ حضرت کے زمانے میں ممالک محروسہ میں ریلوں کا جال بچھ گیا ہے، چنانچہ اب ایک شخص حیدرآباد سے آسانی کے ساتھ بغیر ریل بدلے ہوئے ہندوستان کے دوسرے بڑے بڑے شہروں مثلاً دہلی،

مدراس، بمبئی، بنگلور، میسور وغیرہ آرام و آسائش اور آسانی کے ساتھ جا سکتا ہے۔ اعلیٰحضرت نے یہی نہیں کیا کہ اپنے روپیہ سے ریلیں بنوائیں اور اس کا ٹھیکہ باہر کی کمپنی کو دے دیں، بلکہ علاوہ چند لائنوں کے باقی تمام ریلیں قلمرو کی طرف سے روپیہ دے کر خرید لیں۔

۵۔ لیکن سب سے زیادہ جس محکمے میں ترقی ہوتی ہے وہ تعلیمات کا صیغہ ہے، اور اس میں بالکل مبالغہ آمیزی نہیں کہ آج کل کی ترقی دیکھتے ہوئے یہ شعبہ خود اعلیٰحضرت ہی کا ساختہ پرداختہ سمجھنا چاہیئے۔ سرکار نے اپنی عزیز رعایا کے تعلیم کے لئے گویا اپنے خزانے کے دروازے کھول دئے ہیں اور ابتدائی تعلیم کو مفت کر کے چھوٹے سے چھوٹے اور غریب سے غریب بچے کے لئے بھی تعلیم کے وسائل بہم پہنچا دئے ہیں۔ اعلیٰحضرت کے تخت نشینی سے اس وقت تک ابتدائی مدارس کی تعداد ڈھائی گنی سے زیادہ ہوگئی ہے اور اعلیٰ تعلیم میں تو اعلیٰحضرت کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے، اس لئے کہ اسی زمانے میں وہ جامعہ عثمانیہ قائم ہوئی جس نے تمام محبان ملک کی امیدوں اور آرزوؤں کو پورا کر دکھایا۔ سرکار نے اپنی عزیز رعایا کے بچوں کی مشکلات اور تکلیفوں اور اس تضیع اوقات کا اندازہ کر کے جو غیر زبان میں

معمولی معمولی علوم کے حاصل کرنے سے ہوتی ہیں، حکم دیا کہ ایک ایسی جامعہ (یونیورسٹی) بنائی جائے جس میں تمام علوم و فنون کا درس اور امتحانات اس ملک کے عام زبان اردو میں ہوں، لیکن ساتھ ہی انگریزی لازمی رہے۔ یہ تجربہ اس قدر کامیاب ہوا ہے کہ اس کی دیکھا دیکھی ہندوستان کی بہت سی دوسری یونیورسٹیوں میں بھی بعض امتحانات کی حد تک طالبِ علم کو اپنی زبان میں جواب دینے کی آزادی دی جا رہی ہے۔ دیکھو اگر تمہیں یہ کتاب تمہیں انگریزی میں پڑھنی پڑتی تو تمہیں کس قدر دقت ہوتی؟ اعلیٰ حضرت کے مبارک خیال اور جامعۂ عثمانیہ کے قیام کا نتیجہ ہے کہ تمہیں یہ کتاب اپنی زبان میں پڑھائی جا رہی ہے۔ انھیں باتوں سے متاثر ہو کر چند سال ہوئے جامعۂ عثمانیہ نے "سلطان العلوم" کی سند اور خطاب اعلیٰحضرت کے سامنے پیش کیا اور انھوں نے کمال شفقت کے ساتھ اسے منظور فرمالیا۔

۲۔ اگر ہم ان فرامین کو دیکھیں جو ہمارے بادشاہ نے ہماری بہتری کے لیے وقتاً فوقتاً شائع کیے ہیں تو ہمیں ان کی محبت اور شفقت کا اور بھی زیادہ اندازہ ہو جائے گا۔ وہ ہر ایک مذہب کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں اور گو وہ اپنے پیارے مذہب اسلام پر دل و جان سے فریفتہ ہیں، لیکن ان کے حکم سے دیولوں، گرجاؤں اور گردواروں، عیسائیوں، سکھوں

اور ہندوؤں کی مذہبی اور دینوی انجمنوں اور مدرسوں کے لئے لاکھوں روپیہ خرچ ہوتا ہے، اور حال کے ایک فرمان مبارک کے ذریعے سے یہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ انتظامی معاملات میں تمام مذاہب کے پیروؤں کو بالکل ایک ہی نظر سے دیکھا جائے گا اور کسی قسم کا فرق روا نہیں رکھا جائے گا۔ ایک دوسرے فرمان مبارک کا منشا ہے کہ ممالک محروسہ کے خدمات پر جو تقررات ہوں گے ان میں یہاں کے باشندوں کو باہر والوں پر ترجیح دی جائے گی۔ سرکار نے اپنے عہد میمنت مہد میں مرغ بازی، بلبل بازی بٹیر بازی اور دوسرے ایسے ہی ظالمانہ کھیلوں کی ممانعت کر دی ہے اور اپنی پیاری ہندو رعایا کی دلجوئی کے لئے بقرعید میں گائے کی قربانی ممنوع قرار دی ہے۔ الغرض اعلیٰ حضرت کی نگاہ ملک کے ہر شعبے پر ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومت اور رعایا کے مفاد کے اعتبار سے ہماری قلمروئے حیدرآباد ہندوستان کے کسی دوسرے حصے سے کم نہیں اور ہر فرد، خواہ وہ کسی مذہب کا نام لیوا ہو، سرکار کا دل و جان سے وفادار اور ان کے حکم کا تابع ہے۔

۷۔ یہی نہیں کہ اعلیٰ حضرت صرف ممالک محروسہ ہی کے انتظامات کی طرف توجہ فرماتے ہیں، بلکہ ان کے مبارک زمانے

میں حیدرآباد کی آواز دور و دراز تک پہنچی ہے اور جب اس بادشاہ کے داخلی و خارجی انتظامات کا ذکر آتا ہے تو خود وزیر اعظم برطانیہ کا منھ اس کی تعریف میں سوکھتا ہے۔ تھیں شاید معلوم ہو کہ تمام دُنیا کے ملکوں نے جنیوا (ملک سوئیزرستان) میں ایک انجمن اقوام بنائی ہے۔ اس انجمن میں ہمارے سب سے پہلے صدر اعظم سر علی امام نواب مؤید الملک بہادر جملہ ہندوستانی والیان ملک کی طرف سے قائم مقام بن کر گئے اور ہماری قلمرو کی تمام دُنیا کے نائبوں کے سامنے دھاک بٹھا دی۔ چار سال سے زائد ہوئے جب ملک ہند کی انتظامی اصلاحات پر سوچ بچار کرنے کے لئے تمام برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کے قائم مقام لندن بلائے گئے تو اس نہایت اہم موقعہ پر سرکار نے اپنے وفادار اور با تدبیر صدر المہام سر اکبر حیدری نواب حیدر نواز جنگ بہادر کی سرکردگی میں صدر المہاموں کا ایک وفد لندن روانہ کیا اور اس وفد نے جو کارہائے نمایاں انجام دئیے وہ سونے کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں۔ نواب صاحب موصوف جنھوں نے حیدرآباد کے مالیات کا صحیح و خاطر خواہ انتظام کر کے اس قلمرو کو اوج کمال تک پہنچا دیا ہے ان "گول میز کانفرنسوں" کے سلسلے میں تین مرتبہ ہندوستانی اور انگریز مدبروں سے گفتگو کرنے انگلستان گئے اور ہر مرتبہ حیدرآباد کا نام پہلے سے بھی زیادہ چمکایا۔

یوں تو رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے قلمروے سرکار عالی
تمام ہندوستانی ریاستوں میں پہلے ہی سے ممتاز تھی، اب
وہ تدبّر و دستور سازی کے میدان میں بھی نہ صرف صفِ
اوّل میں آگئی، بلکہ جو سیادت و صدارت اسے حاصل ہونی
چاہیئے تھی وہ عملاً اسے مل گئی۔ اب تو ایسی سرکاری کانفرنس
کوئی نہ ہوگی خواہ وہ ہندوستان میں ہو یا انگلستان میں،
جس میں حکومت ہند کے مسائل پر غور کیا جائے اور حکومت
حیدرآباد کے قائم مقام نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر
کی وقیع رائے کو ممتاز ترین حیثیت نہ دی جائے۔

۸ ۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو چند ہی مہینے میں
ہمارے پیارے بادشاہ اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خسروِ دکن
کی تاجپوشی کی پچیسویں جشن میں، جو انشاءاللہ نہایت
دھوم دھام سے منایا جائے گا، ہم سب حصہ لیں گے،
اور اپنی اپنی بساط کے بموجب اپنے وفادارانہ جذبات
کا اظہار کریں گے۔ ہمیں چاہیئے کہ خود اپنے بادشاہ کا لکھا
ہوا ترانہ ابھی سے یاد کرلیں تاکہ اس عظیم الشان جشن
کے موقع پر ہمیں نادم نہ ہونا پڑے۔

تا ابد خالق عالم یہ ریاست رکھے — تجھ کو عثمان بصد اجلال سلامت رکھے
جیسے تو فخرِ سلاطین ہے بفضلِ یزداں — یوں ہی ممتاز ترا دورِ حکومت رکھے

آل اولاد کو اللہ دے عمرِ خضری — ان سے آباد ترا خانۂ دولت رکھے
جو دوقائم ہے ہے شرمندۂ احساں تیرا — عدلِ کسریٰ کو خجل تیری عدالت رکھے
خندہ زن صورتِ گل تیرے ہوا خواہ رہیں — آ کے قدموں پہ عدو فرقِ اطاعت رکھے
سب رعایا کو تری سالگرہ کی تقریب — با نشاط و طرب و عیش و مسرت رکھے

بن کے ساقی ترا اقبال نظامِ سابع
تجھ کو صہباکشِ خمخانۂ عشرت رکھے

خاتمہ

اب تم نے اپنے دیس کی کہانی بالکل شروع سے لے کر آج تک کی سن لی ہو
ور تم یہ سمجھ گئے ہو کہ اس ملک نے پچھلے زمانے میں کیسی کیسی ترقی کی، کیسے پہلے
س میں دو بڑی بڑی ریاستیں یعنی ایک ورنگل کی اور دوسری دیوگڑھ کی قائم تھیں،
ں طرح دہلی کے بادشاہ سلطان علاء الدین خلجی نے اسے فتح کیا، پھر سلطان محمد تغلق
ے زمانے میں یہ خطہ آزاد ہو گیا اور بہمنیوں نے اس پر حکومت کرنی شروع کی، پھر بہمنی
دشاہوں میں بری عادتیں پیدا ہونے اور آپس میں لڑائی جھگڑے پیدا ہو جانے کی
ہ سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے یہاں تک کہ ان ٹکڑوں کو اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں
ر اورنگ زیب جیسے عظیم الشان شہنشاہوں نے زیر کر لیا۔ آخر کار جب سلطنت
ہند میں بھی آپس کے لڑائیوں کی وجہ سے پھوٹ پڑ گئی تو ایک پیر جوان ہمت
صف جاہ اوّل شمال سے آئے اور اسے دوسروں کی دست برد سے آزاد کر کے
یک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جو اللہ تعالیٰ کے فضل سے آج تک موجود اور
چاردانگ عالم میں مشہور ہے۔ آؤ ہم اس سلطنت ابد مدت کے قیام اور
حکام کی صدق دل سے دعا کریں اور خدا سے التجا کریں کہ ہمارے
ران اعلیٰ حضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ اور ان کے خاندان
ہر آفت ارضی و سماوی سے محفوظ رکھیو اور انھیں ہمارے سروں پر قائم
دائم رہنے دیجیو۔ آمین ثم آمین

تتمہ حصہ سوم

شجرۂ بادشاہان تیموریہ (ہند)

- (۱) بابر — سنہ ۱۵۲۵ء / ۱۵۳۰
- (۲) ہمایوں — سنہ ۱۵۳۰ء / ۱۵۵۵ (بدفعات)
- (۳) اکبر — سنہ ۱۵۵۵ء / ۱۶۰۵
- (۴) جہانگیر — سنہ ۱۶۰۵ء / ۱۶۲۷
- (۵) شاہ جہاں — سنہ ۱۶۲۷ء / ۱۶۵۸
- (۶) اورنگ زیب — سنہ ۱۶۵۸ء / ۱۷۰۷
  - (۷) اعظم — سنہ ۱۷۰۷ء
  - (۸) شاہ عالم بہادر شاہ — سنہ ۱۷۰۷ء
    - (۹) جہاندار — سنہ ۱۷۱۱ء / ۱۷۱۲
      - (۱۵) عالمگیر ثانی — سنہ ۱۷۵۴ء / ۱۷۵۹
      - (۱۶) شاہ عالم ثانی — سنہ ۱۷۵۹ء / ۱۸۰۶
      - (۱۷) اکبر ثانی — سنہ ۱۸۰۶ء / ۱۸۳۷
      - (۱۸) بہادر شاہ ثانی — سنہ ۱۸۳۷ء / ۱۸۵۷
    - خجستہ اختر
      - (۱۳) محمد — سنہ ۱۷۱۹ء / ۱۷۴۸
      - (۱۴) احمد — سنہ ۱۷۴۸ء / ۱۷۵۴
    - رفیع الشان
      - (۱۱) رفیع الدرجات — سنہ ۱۷۱۹ء
      - (۱۲) شاہ جہاں ثانی — ۱۷۱۹
    - عظیم الشان
      - (۱۰) فرخ سیر — سنہ ۱۷۱۲ء / ۱۷۱۹

شجرۂ فرمانروایان آصفیہ (سنین حکومت دکن سے متعلق ہیں)

نواب میر عابد قلیچ خاں بہادر (مدفون قریب حمایت ساگر نزد حیدرآباد)

نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ

(۱) حضرت نظام الملک آصف جاہ اول سنہ ۱۷۲۴ / ۱۷۴۸ء

(۲) نواب ناصر جنگ بہادر سنہ ۱۷۴۸ / ۱۷۵۱ء

خیر النسا بیگم صاحبہ = نواب رستم جنگ

(۳) نواب مظفر جنگ بہادر ۱۷۵۱ء

(۴) نواب صلابت جنگ بہادر ۱۷۵۱ / ۱۷۶۱ء

(۵) نواب میر نظام علیخاں بہادر
آصف جاہ ثانی سنہ ۱۷۶۱ / ۱۸۰۳ء

(۶) نواب سکندر جاہ بہادر
آصف جاہ ثالث سنہ ۱۸۰۳ / ۱۸۲۹ء

(۷) نواب ناصر الدولہ بہادر
آصف جاہ رابع سنہ ۱۸۲۹ / ۱۸۵۷ء

(۸) نواب افضل الدولہ بہادر
آصف جاہ خامس سنہ ۱۸۵۷ / ۱۸۶۹ء

(۹) نواب میر محبوب علی خاں بہادر
آصف جاہ سادس سنہ ۱۸۶۹ / ۱۹۱۱ء

(۱۰) اعلیحضرت نواب میر عثمان علیخاں بہادر
خلد اللہ ملکہ
آصف جاہ سابع

فہرست گورنر جنرلان ہند

(١) وارن ہیسٹنگز — ١٧٧٤ء – ١٧٨٥

(٢) کورن والس — ١٧٨٥ء – ١٧٩٣

(٣) شور — ١٧٩٣ء – ١٧٩٨

(٤) مورننگٹن (ویلزلی) — ١٧٩٨ء – ١٨٠٥

(٥) کورن والس — ١٨٠٥

(٦) بارلو — ١٨٠٦ء – ١٨٠٧

(٧) منٹو اول — ١٨٠٧ء – ١٨١٣

(٨) موئرا (ہیسٹنگز) — ١٨١٣ء – ١٨٢٣

(٩) ایمہرسٹ — ١٨٢٣ء – ١٨٢٨

(١٠) بینٹنک — ١٨٢٨ء – ١٨٣٥

(١١) میٹکاف — ١٨٣٥ء – ١٨٣٦

(١٢) آکلینڈ — ١٨٣٦ء – ١٨٤٢

(١٣) ایلین برہ — ١٨٤٢ء – ١٨٤٤

(١٤) ہارڈنج اول — ١٨٤٤ء – ١٨٤٨

(١٥) ڈیل ہاؤزی — ١٨٤٨ء – ١٨٥٦

(١٦) کیننگ — ١٨٥٦ء – ١٨٥٨

فہرست وائسرایان ہند

(١) کیننگ — ١٨٥٨ء – ١٨٦٢

(٢) ایلگن اول — ١٨٦٢ء – ١٨٦٣

(٣) لورنس — ١٨٦٤ء – ١٨٦٩

(٤) میو — ١٨٦٩ء – ١٨٧٢

(٥) نورتھ بروک — ١٨٧٢ء – ١٨٧٦

(٦) لٹن — ١٨٧٦ء – ١٨٨٠

(٧) رپن — ١٨٨٠ء – ١٨٨٤

(٨) ڈفرن — ١٨٨٤ء – ١٨٨٩

(٩) لینسڈون — ١٨٨٩ء – ١٨٩٤

(١٠) ایلگن دوم — ١٨٩٤ء – ١٨٩٨

(١١) کرزن — ١٨٩٨ء – ١٩٠٥

(١٢) منٹو دوم — ١٩٠٥ء – ١٩١٠

(١٣) ہارڈنج دوم — ١٩١٠ء – ١٩١٦

(١٤) چیمسفورڈ — ١٩١٦ء – ١٩٢٠

(١٥) ریڈنگ — ١٩٢٠ء – ١٩٢٥

(١٦) اروِن — ١٩٢٥ء – ١٩٣٠

(١٧) وِلنگڈن — ١٩٣٠ء